فیض اکیڈمی

FAIZ CULTURAL ACADEMY

اردو سینٹر

URDU CENTRE LONDON

ماہنامہ ادب دوست کے مدیر اے جی جوشؔ کی خصوصی دعوت پر ادب دوست کے نئے رابطہ آفس کپور تھلہ ہاؤس (پرانی انار کلی) میں معروف شاعر دانشور اور عظیم افسانہ نگار احمد ندیم قاسمی کی تشریف آوری کے موقع پر لی گئی ایک یادگار تصویر

اے جی جوشؔ کی جانب سے جناب احمد ندیم قاسمی کے اعزاز میں دیئے گئے ظہرانے کے شرکا

بیٹھے ہوئے (دائیں سے) انتظار حسین، احمد ندیم قاسمی، ناہید قاسمی، منصورہ احمد

(کھڑے ہوئے) حیات احمد خان، اعجاز رضوی، اے جی جوشؔ، مشکور حسین یاد، ڈاکٹر سلیم اختر، عطاء الحق قاسمی، ڈاکٹر طاہر تونسوی، خالد لطیف (کینیڈا)

ماہنامہ لاہور

ادب دوست

جلد نمبر 11 ● اپریل 2005ء ● شمارہ نمبر 4

رجسٹرڈ ایل نمبر 117

قیمت فی پرچہ 20 روپے ● سالانہ 200 روپے

ناشر اے۔ جی جوش نے رحمٰن شمس پرنٹرز آبکاری روڈ لاہور سے چھپوا کر 39 کمرشل زون لبرٹی مارکیٹ گلبرگ III لاہور سے شائع کیا۔ فون: 5763143

اس شمارے میں

اداریہ

21 اپریل مصورِ پاکستان حضرت علامہ اقبالؒ کا یوم وفات ہے۔اس موقع پر انہیں یاد کرنے کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ اُن کے افکار کو مشعلِ راہ بنایا جائے۔حضرت علامہ نبیِ کریم ﷺ کے عاشق صادق تھے۔اسلام سے گہری محبت رکھتے تھے اور اُمتِ مسلمہ کے اتحاد کے داعی تھے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ صحیح طور پر روشن خیال بننے کے لیے علامہ اقبالؒ کے افکار کو حرزِ جاں بنایا جائے۔

اے جی جوش

تعزیت نامہ

ممتاز ناول نگار سلمیٰ کنول طویل علالت کے بعد انتقال کر گئیں،ان کے ناول قارئین میں بے حد پسند کیے جاتے تھے،جبکہ دو ناولوں پر فلمیں بھی بنائی گئیں جو بے حد مقبول ہوئیں۔

مقبول شاعر اور کمپیئر اعزاز احمد آذر کی والدہ محترمہ گزشتہ دنوں قضائے الٰہی سے رحلت فرما گئیں۔

ایبٹ آباد میں مقیم ممتاز شاعر سید صفدر حسین جعفری کی اہلیہ محترمہ رحلت فرما گئیں۔

مدیر ادب دوست اور ادارہ ادب دوست کے جملہ ارکان،ان مرحومین کی مغفرت کے لیے دعا گو ہیں۔ربِ کریم ان سب کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور لواحقین کو صبرِ جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔آمین

ادارہ

سید مشکور حسین یاد

حمد

بہتے ہوئے دریا سے اشک میں کہیں بڑھ کر ہے
حمد و نعت کا یہ ننھا سا امیں کہیں بڑھ کر ہے

اس کا قریب رگ جاں ہونا قرب کو کرتا ہے بے پایاں
دور کو کتنا بھی پھیلاؤ قریں کہیں بڑھ کر ہے

فلک فلک پر پہنچے آقا ! پھر بھی زمیں پر آئے
دیکھو زماں کی بات نہ کرنا زمیں کہیں بڑھ کر ہے

دید کے موقع بہت ہیں لیکن قابل دید ہے لا محدود
حسن و جمال عالم سے وہ حسیں کہیں بڑھ کر ہے

اس کی وسعت اس کی رفعت اس کی عظمت قرب کی شان
اس کا ہونا دور نہیں وہ یہیں کہیں بڑھ کر ہے

ساری بلندیاں سب افلاک سمیٹ لے چشم زدن میں
سجدے میں جو جھک جائے وہ جبیں کہیں بڑھ کر ہے

یقیں کی دولت آئینہ آئینہ ہے جان مشکور
گمان امان کہاں دیتا ہے یقیں کہیں بڑھ کر ہے

●

حسن عسکری کاظمی

حمد باری تعالٰے

وہ پھول جو وجدان کے صحرا میں کھلا ہے
اس پھول کی خوشبو کے تعاقب میں ہوا ہے
کہیے کہ قریب رگ جاں ہے وہی جاناں!
وہ شوخ ہے ایسا جسے دیکھا نہ سنا ہے
کلیوں کا تبسم بھی تو مسکان ہے اس کی
دیکھا تو وہی پھول کے پردے میں چھپا ہے
ادراک کی لہروں میں رواں ہے وہ ازل سے
وہ خون میں شامل ہے مگر پھر بھی جدا ہے
پہنچا ہے سر عرش تصور کا پرندہ
یہ قوت پرواز بھی خالق کی عطا ہے
طاری ہے مرے ذہن پہ اک عالم حیرت
جنت بھی فقط اس کی محبت کا صلہ ہے
اک حرف ستائش بھی تراشا نہیں جاتا!
جو تیر بھی نکلا ہے کمان سے وہ خطا ہے
یہ سوچ کے رکھا ہے قلم ہاتھ سے میں نے
کیا حمد ہو اس کی جو دو عالم کا خدا ہے
کھل جائے حسن کا یہ عقیدہ بھی جہاں پر
بندوں سے محبت مرے خالق کی رضا ہے

●

ریاض حسین چودھری، سیالکوٹ

نعت رسولِ مقبول ﷺ

صلِ علیٰ کا لب پہ ہے گلشن کھلا ہوا
میلہ ہے خوشبوؤں کا ازل سے لگا ہوا

تاریخ اضطراب کے عالم میں ہے حضور
اقوام ارض شب کا بدن ہے جلا ہوا

طوفان تند و تیز میں صدیوں سے یا نبی
کاغذ کی کشتیوں کا ہے بیڑا گھرا ہوا

آقا ہوائے عدل مقفل ہے ان دنوں
محشر دیار لوح و قلم میں بپا ہوا

اُمت کھڑی ہے زر کی تپش کے حصار میں
اس کا برہنہ سر بھی ہے کب سے جھکا ہوا

اس عصر نو کو عجز کی چادر عطا کریں
ہر آئنہ ہے گرد انا سے اٹا ہوا

ہم لوگ دشت خوف میں تنہا ہیں اس طرح
صحرا میں جیسے دھوپ کا دریا بچھا ہوا

دستِ صبا پہ چاند کی کرنوں نے رکھ دیا
اشک رواں سے میرا قصیدہ لکھا ہوا

ڈرتا ہوں میں حضور نہ جائے چھلک کہیں
آنسو ہے ایک چشم غزل میں رکا ہوا

دھڑکن ہر ایک ان سے ہے منسوب اس لیے
خاک در رسول سے ہے دل بنا ہوا

خوشبو طواف میرے قلم کا کیا کرے
ہونٹوں پہ اس کے اسم نبی ہے سجا ہوا

چہرہ تو اس کا جانب شہر نبی کرو
دیکھو، چراغ شب ہے ابھی سے بجھا ہوا

ہر ہر قدم پہ زائر طیبہ زر ادب
تجھ کو ملے گا راہگذر میں پڑا ہوا

آنکھوں نے بھی درود ہے بھیجا تمام شب
صحن جوار دیدہ و دل ہے دھلا ہوا

اک کیف سرمدی کا تواتر سے ہے نزول
نعت نبی کا ہو گا دریچہ کھلا ہوا

مانگا بھی تھا ریاضؔ وسیلہ حضورؐ کا
دست دعا ہے آج بھی تیرا اٹھا ہوا

غیاث الدین غیاث، کراچی

نعتِ رسولِ مقبول ﷺ

اے کاش کہ مل جائے محبت کا سلیقہ
تو نعت میں آ جائے گا مدحت کا سلیقہ

ہر رُخ سے فقط آپ کے جلوؤں کی طلب ہو
آنکھوں کو جو مل جائے بصارت کا سلیقہ

ہیں دامنِ رحمت کی پناہوں میں عدو بھی
یوں ہم کو سکھایا گیا شفقت کا سلیقہ

ہر آن درودوں سے سلاموں سے ہو مطلب
پھر ہستی بھی پا جائے گی رفعت کا سلیقہ

سنگ درِ آقا سے نہ اُٹھے گا کبھی بھی
گر دل کو میسر ہو عبادت کا سلیقہ

آ جائے غیاثؔ آپ کے خدام کی صف میں
ہو کاش عطا دین کی خدمت کا سلیقہ

عرفانہ امر، گوجرانوالہ

نذرانہ عقیدت

بحضور سرورِ کائنات ﷺ

لکھیں جو حمد تو لکھتے ہیں ہم وضو کر کے
کہیں جو نعت تو کعبے کو روبرو کر کے
برس رہے ہیں جو موتی چمک رہی ہے کلی
محبِّ حبیب سے پلٹا ہے گفتگو کر کے
یہ لگ رہا ہے ہواؤں کی نرم آہٹ سے
کوئی ہے محوِ سفر ان کی آرزو کر کے
یہ رنگ و نور جو پھیلا ہے آس پاس مرے
تمہاری ذات کے انوار کی نمو کر کے
ہرا بھرا ہے میرے دل کا چمن بہ فیضِ نبی ﷺ
نگاہِ لطف و کرم پائی جستجو کر کے
جو تیرے جلووں کے شیدا ہیں پا ہی لیں گے انہیں
درود پڑھ کے کبھی رو کے حق و ہو کر کے
جمال فخر سے آگے کمال فن بھی تو دیکھ
جو چاک داماں چلے بزم سے رفو کر کے
درِ بہشت پہ ٹھہرے ہیں انبیائے کرام
امام پہنچیں گے، اُمت کو سرخرو کر کے

سید مشکور حسین یاد

مسلم اُمہ کے مسائل اور اقبال

میں مسلم امہ کے مسائل پر گفتگو کرنا چاہتا ہوں لیکن معاف کیجئے مسلم امہ ہے کہاں جس کے مسائل کو میں یا آپ زیر بحث لانا چاہتے ہیں۔ ہمیں اس حقیقت کو ابتدا ہی میں ٹھنڈے دل سے یا کڑے دل سے تسلیم کر لینا چاہیے کہ مسلم امہ اور سب کچھ ہو سکتی ہے لیکن وہ مسلم نہیں ہے۔ لہٰذا اس وقت مسلم امہ کا صرف ایک ہی مسئلہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو یعنی ہم اپنے آپ کو صحیح معنی میں مسلم یعنی مسلمان بنائیں۔ میں اس ضامن میں آپ کو یہ مشہور شعر سنا کر بددل یا خوش دل بلکہ خوف زدہ نہیں کرنا چاہتا کہ

یہ شہادت گہ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلمان ہونا

کسی بات کے آسان یا مشکل ہونے کا سوال تو اس وت پیدا ہوتا ہے جب آپ اس پر غور کرنے کے لیے تیار ہوں۔ ہم مسلمانوں کی جی ہاں ساری دنیا کے مسلمانوں کی اس وقت سب سے بڑی قباحت یہی ہے کہ وہ اپنے مسلمان ہونے پر غور نہیں کر رہے ہیں۔ وہ تو نام کے مسلمان ہونے کو ہی کافی سمجھے ہوئے ہیں یا زیادہ سے زیادہ پانچ وقت نماز پڑھتے، روزہ رکھنے، تھوڑی بہت زکوٰۃ دینے کو مسلمان ہونا سمجھ کر خوش اور مطمئن ہیں۔ اپنے عقیدے کے لحاظ سے...... حالانکہ اسلام میں عقیدہ بنیادی حیثیت اس اعتبار سے رکھتا ہے کہ وہ غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ یعنی اسلام میں اندھی عقیدت کے نام کی کوئی چیز موجود نہیں ہے۔

اس مختصر سی تمہید سے میرا یہ مطلب ہرگز ہرگز نہیں ہے کہ ہمیں آج کی مسلم امہ کے سیاسی، معاشی، معاشرتی، سائنسی وغیرہ مسائل سے صرف نظر کرنا چاہیے یا ان مسائل کی کوئی اہمیت ہی نہیں ہے۔ محرز حاضرین کرام بات دراصل یہ ہے کہ جب تک ہم اپنا عقیدہ درست نہیں کریں گے بہ حیثیت مسلمان ہماری زندگی کے دوسرے مسائل بھی درست نہیں ہوں گے۔ یوں تو دین ساری دنیا کی اقوام کا ایک ہی ہے صرف شریعتیں مختلف ہیں لیکن چونکہ دوسرے مذاہب کی شریعتوں میں دنیا از خود داخل ہو گئی ہے اور ہم مسلمانوں کے پاس ہماری کتاب اپنی اصل صورت میں موجود ہے اس کے ہماری شریعت میں از خود دنیا داخل ہونا بھی چاہے تو نہیں ہو سکتی۔ اس لیے ہم نام کے مسلمان ہو کر بھی کچھ نہ کچھ مسلمان ضرور رہتے ہیں لیکن ہمارے کچھ نہ کچھ مسلمان ہونے نے ہمیں خراب اس لیے کر رکھا ہے کہ ایک طرف تو ہمارا دین ہمیں پورا مسلمان دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ ہمارے کچھ نہ کچھ مسلمان ہونے سے قطعی مطمئن نہیں۔ دوسری طرف دنیا ہمیں

ذرا سا بھی مسلمان دیکھنا نہیں چاہتی۔ ہمیں پوری طرح دنیا دار بنانا چاہتی ہے۔ لہٰذا آج کی مسلم امہ یعنی ہم مسلمان نہ ہی اپنے دین کو منہ دکھانے کے قابل رہے ہیں اور نہ دنیا کو۔ وہی عامیانہ سی بات نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم نا ادھر کے رہے نا ادھر کے رہے۔

چنانچہ مسلم امہ کی اسی صورت حال کو دیکھتے ہوئے علامہ اقبال نے اپنی تمام شاعرانہ اور فلسفیانہ مساعی کا رخ اس طرف پھیر دیا کہ مسلمانوں کے عقیدہ کو درست کیا جائے۔ دوسرے معنوں میں یوں کہ لیجئے کہ "اقبال نے اسلام کی مذہبی فکر یعنی الٰہیات کو نئے سرے سے تشکیل دینے کی سعی کی" اس طرح کی کوششیں اقبال سے پہلے بھی کی گئیں لیکن ان کا سارا زور یونانی فلسفے کو اپنے ڈھب پر لانے میں صرف کیا جاتا رہا جبکہ اقبال نے یونانی فکر سے فیض حاصل کرنے کے بجائے اس پر کڑی تنقید کی ہے۔ اقبال کا سب سے بڑا اعتراض یونانی فکر پر یہ ہے کہ یونانی فلسفی صرف سوچ بچار پر زور دیتے ہیں یعنی وہ محض Specupatim ہیں اور خالی پھیکی سوچ کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ وہ نہ تو انسان ٹھوس یعنی محسوس و مادی حقائق کو گرفت میں لانے کے قابل چھوڑتی ہے اور نہ ہی اس کے ذریعہ حقیقت مطلقہ یعنی Ultimate Reality کا علم حاصل کیا جا سکتا ہے اور تو اور خالی سوچ بچار تو حقیقت مرئی یعنی عالم محسوس سے بھی انکاری ہو جاتی ہے۔ مثال کے طور پر اسی خالی پھیکی سوچ بچار نے افلاطون کو اس عقیدے تک پہنچا دیا کہ یہ دنیا جس کو ہم اور آپ دیکھ رہے ہیں۔ غیر حقیقی ہے کیونکہ وہ متغیر ہے جبکہ حقیقت کو قائم و دائم ہونا چاہیے۔ لہٰذا دوام اس دانائی کو نہیں تصورات یعنی اعیان کو ہے اور جیسا کہ کانٹ نے کہا ہے کہ ان تمام تصور میں Idealists کا نقطہ نظر یہ ہے کہ حواس اور مشاہدے کے ذریعے جو کچھ ہمیں معلوم ہوتا ہے وہ سب التباس Illunion یعنی قرب نظر ہے۔ صداقت صرف فہم محض Pure Understading اور عقل یعنی Reason میں ہے لیکن آپ جانتے ہیں کوئی علم تجربے کے بغیر ممکن نہیں۔ اسی لیے خالی سوچ بچار کرنے والے خلا میں معلق رہتے ہیں۔

چنانچہ اقبال نے جدید فلسفے سے ان محسن ہی فیض اٹھایا کہ کانٹ کے بعد تمام کا تمام جدید فلسفہ تجربی یا عملی یعنی Empirical ہو گیا اور آپ جانتے ہیں اسلام کی روح بھی بنیادی طور پر عملی ہے وہ اس کائنات کو غیر حقیقی نہیں سمجھتا۔ اس لیے اقبال اپنے لیکچروں اور اشعار میں واضح کرتے ہیں کہ اسلام نے تجربے پر اس زمانے میں زور دیا جب سائنس اس سے آشنا نہ تھی۔ اقبال کا بڑا مشہور شعر ہے۔

حقائق ابدی پر اساس ہے اس کی
یہ زندگی ہے نہیں ہے طلسم افلاطوں

لیکن آپ جانتے ہیں جدید سائنس کی روح بعض جدید فلسفیانہ مکاتب فکر کی طرح بہت ادعائی ہے یعنی Domatic۔ جدید علوم اور فلسفے حسی تجربے پر زور دیتے ہیں اور کہتے ہیں صرف محسوسات ہی حقیقی نہیں۔ یہ کسی ایسی حقیقت کے امکان کے قائل نہیں جو حسی

تجربے سے ماورا ہو۔اس کے برعکس اسلام یہ کہتا ہے کہ محسوسات سے ماورا ایک بنا افق ہے۔ ماورائی حقیقت کا افق یعنی اسلام کا کہنا یہ ہے کہ محسوسات ہی تنہا حقیقت نہیں۔ دوسری طرف سائنس دان اپنے حسی تجربے کو اس قدر اہم سمجھتے ہیں کہ وہ کسی ماورائی حقیقت کو تسلیم کرنے سے قاصر ہیں۔ گویا جدید ذہن کسی روحانی تجربہ کا قائل نہیں اور اسی کے وہ خدا اور حیات بعد ممات پر ایمان نہیں رکھتا۔ یوں جدید ذہن کے لیے یہ مادی دنیا اشیاء اور واقعات کے درمیان ایک کبھی نہ تبدیل ہونے والا لازمی رشتہ ہے، جس کی وجہ سے جدید ذہن کی نظر میں یہ کائنات خودکار مشینی یعنی میکانکی بن کر رہ گئی ہے۔ وہ ایک محسن یعنی جبری انداز میں ہو رہا ہے، جس میں اختیار کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے اور اختیار سے انکار کرنے کا یہ نتیجہ ہوا ہے کہ انسان کی تمام آرزوئیں، امنگیں گھٹ کر رہ گئی ہیں۔ اختیار تمام مذہبی اور عملی سرگرمیوں کے لیے ایک لازمی چیز ہے۔ میکانیت انسان کی ذات کو مشینی قوتوں کی آماجگاہ بنا دیتی ہے۔ جس کا اپنے طور پر کوئی آزاد وجود باقی نہیں رہتا۔ چنانچہ اقبال کے پیش نظر سب سے بڑا مسئلہ وجود باری تعالیٰ ذات یعنی انسان کی خودی کی حیثیت اور انسانی اختیار اور حیات بعد ممات کو ثابت کرنا ہے اور یوں اقبال کا فلسفہ بنیادی طور پر مذہبی فلسفہ ہے۔ گویا اقبال مذہبی سچائیوں کو ثابت کرنا چاہتے ہیں جبکہ محض کوئی تصوری یعنی نظریہ اور محض حسی تجربہ یہ دونوں ہی ان صداقتوں کو ثابت کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔ کانٹ کے برخلاف اقبال علم کو عملی یا تجربی حقیقت یعنی محسوسات تک محدود کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں بلکہ وہ اس سے آگے لے جاتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے اور یہاں اقبال ایک اعتبار سے صوفی بن جاتے ہیں کہ باری تعالیٰ، اسرار ذات یعنی خودی، انسانی اختیار اور حیات بعد ممات Life after Death کا راز آشکار ہو سکتا ہے لیکن ایک غیر معمولی تجربے کے ذریعہ جس کو اقبال وجدان کا نام دیتے ہیں۔ حقیقت کو کلی طور پر گرفت میں لینا یعنی حقیقت مطلقہ کا ادراک کرنا ہی وجدان کا سب سے بڑا مقصد ہے۔ اقبال اس کو نادر تجربہ بتاتے ہیں اور صرف چند برگزیدہ افراد کو اس کا امین سمجھتے ہیں۔ غزالی اور دیگر صوفی مفکرین نے بھی وجدان کو علم حاصل کرنے کی ایک نادر صلاحیت یعنی ملکہ قرار دیا ہے۔ جو عقل و ادراک سے مختلف چیز ہے اور اسی بات نے بہت سے مفکرین کے خیال میں وجدان کی اس صلاحیت کو مشکوک بھی بنا دیا ہے لیکن اقبال کا کہنا ہے کہ وجدان بھی عقل اور ادراک ہی کی طرح کا ایک وسیلہ علم ہے۔ البتہ وہ وجدان کو علم کی ارفع صورت قرار دیتے ہیں اگرچہ Quanlitatively یعنی کیفی اعتبار سے وہ دوسرے وسائل علم ہی طرح سے ہے۔ یہ درست ہے کہ وجدان ایک طرح کا احساس Dealing ہے لیکن اس کا مطلب موضوعیت یعنی Subjective ہو کر اپنی ذات میں ڈوب جانا نہیں ہے۔ وجدان کا یہ احساس ہے Felling اپنی خاصیت میں بنیادی طور پر توفی ہے یعنی Cognitive اور حسی ادراک ہی کی طرح معروضی یعنی Objective۔ دراصل وجدان کی معروضیت یعنی Objectivity کو شک کی نظر سے اس لیے بھی دیکھا گیا ہے کہ ایک صوفی حقیقت مطلقہ یعنی خدا کے ادراک سے اپنے وجدان کا آغاز کرتا ہے اور پھر اس کو اسی حد تک محدود رکھنا چاہتا ہے۔ اس کے برعکس

اقبال خود اپنی ذات کے وجدان سے آغاز کرتے ہیں اور یوں وجدان کو ہمارے عام تجربے میں قریب تر لے آتے ہیں۔ وہ ذات کے عرفان کے بعد حقیقت عالم اور پھر حقیقت مطلقہ یعنی Ultimate Reality تک پہنچے ہیں۔ اگرچہ وجدانی نقطہ نظر سے اقبال صوفیانہ عرفان میں ایک انقلاب لے کر آئے ہیں لیکن ذرا غور سے دیکھا جائے تو ایک مشہور حدیث میں اس کو ہمارے نبی کریمؐ نے بہت پہلے واضح طور پر فرمایا ہے کہ مَن عَرفَ نفسہ فقد عَرفَ ربہ۔ جس نے اپنی ذات کو پہنچانا اس نے اپنے رب کو پہنچان لیا اور فلسفے کی جدید دانائی میں ڈیکارٹ کا جو ایک مشہور تاریخی جملہ I think therefore I am میں سوچتا ہوں اس لیے میں وجد رکھتا۔ ڈیکارٹ کے اس جملے نے جدید فلاسفر کو صرف انسان تک محدود کر ڈالا لیکن اقبال کا کمال دیکھئے کہ اس جملہ کو غالباً مذکورہ حدیث کی روشنی میں نہ صرف خودی کے عرفان کا دروازہ کائنات کے عرفان کا دروازہ قرار دیا بلکہ اس کو قدر کی معرفت تک لے گئے۔ بہر حال اپنی ذات کے وجدان کا یہ باب ہم سب کے لیے کھلا ہے۔ اہم اور بڑے بڑے فیصلوں اور عمل کے بعض حساس لمحوں میں ہمیں اس کا تجربہ ہوتا ہے۔ یہ وجدان ہمیں اپنی ہستی کی گہرائیوں تک لے جاتا ہے اور ہمیں اپنی حقیقت کا براہ راست یقین دلاتا ہے۔ تجربین یعنی Empiricist اور عقلین یعنی Rationalist دونوں ہی ذات کی حقیقی ماہیت منکشف کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ تجربین ذات کو صرف واردات نفس یعنی Psychical states کی آمد وشد قرار دیتے ہیں لیکن ان واردات کو ایک دوسرے علیحدہ رکھتے ہوئے وہ اس وحدت کو نظر انداز کر دیتے ہیں جو ان واردات کو ایک کل میں شیرازہ بند کرتی ہے۔ اسی طرح عقلین Rationlist بھی ذات یعنی خودی کی حقیقی ماہیت کو گرفت میں لانے سے قاصر ہیں۔ وہ صرف ایک عقلی وحدت Conceptional unity کو فرض کرتے ہیں۔ جسے خلا Void میں وہ رکھ دی گئی ہوں۔ وہ ذات کی تہہ تک نہیں جاتے۔ لیکن بقول برگساں حقیقی تجربیت True Empivicism یعنی وجدان ہماری ہستی کی انتہائی گہرائیوں کو براہ راست روشن کر دیتا ہے۔ ذات یا خودی اپنی ماہیت میں بنیادی طور پر حرکی Dynamic ہے۔ اس کی ماہیت مسلسل نشوونما، مسلسل اضافہ اور مسلسل عمل ہے۔ ذات کا وجدان ہمیں اشیاء کی حقیقی ماہیت کے انکشاف کی امید دلاتا ہے۔ یہ ہمارے لیے خدا کے عرفان کو ظن وقیاس کے بجائے ایک حقیقی امکان بنا دیتا ہے اور یوں ہم اپنی ہستی اور فطرت سے گزر کر ذات باری تعالیٰ تک پہنچ جاتے ہیں۔ اسی لیے اقبال ہمیں بار بار اپنی ذات میں جھانکنے کی اس سے یگانگت بڑھانے کی ہمدردی کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ تاکہ ایک وقت ہمیں اللہ کا بھی ادراک ہو سکے۔ تاہم اقبال یہ دعویٰ تو نہیں کرتے انہیں خدا کا وجدان حاصل ہوا ہے البتہ انہیں یہ یقین ضرور ہے کہ بعض درخشاں لمحات میں انہیں اپنی ذات کا وجدان ہوا ہے۔ جس سے انہیں یقین ہے کہ اللہ کا وجدان بھی ذات کلی کے وجدان کی سی خاصیت رکھتا ہے۔ اللہ کی ذات بھی اپنی ماہیت میں حرکی اور حد درجہ فعال ہے۔ حقیقت ایک حیات لامتناہی ہے وہ خود راہنما Self directing اور خود شعور توانائی یعنی انرجی ہے۔ دوسری بات اس اللہ کے وجدان

سے ہم پر یہ منکشف ہوتی ہے کہ اللہ کوئی غیر شخصی وجود نہیں ہے جیسا کہ ہم لیست یا ہمہ اوست کے قائل افراد سمجھتے ہیں۔ وہ ایک شخص یعنی پرسن Person ہے اور ہم اس سے شخصی رابطہ قائم کر سکتے ہیں کیونکہ حیات کی ماہیت یہ ہے کہ وہ کسی بھی ذات میں اپنا اظہار کرے۔ کوئی یا کائناتی حیات جیسی کوئی چیز نہیں ہے۔ حیات کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایک مرکز کی حامل ہو جس کو ہم ذہن کہہ سکتے ہیں۔ تیسری بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے وجود سے ہماری ذات کی نفی Obliteration لازم نہیں آتی۔

☆☆☆

☆

دیکھنے کو ظاہر میں کالا ہے لوہا
آگ میں پڑ جائے تو اجالا ہے لوہا

ہاتھ اٹھیں تو روئی کا گالا ہے لوہا
قدم بڑھیں تو پاؤں کا چھالا ہے لوہا

ہیلی کاپٹر بن کے اونچا چڑھتا جائے
شیر کی کیا اب سب کی خالا ہے لوہا

پھر بھی ہمارے عزائم سے مضبوط نہیں
خوب ہمارا دیکھا بھالا ہے لوہا

اس نے حفاظت کی ہے حضور کی ہجرت میں
اپنی جگہ مکڑی کا جالا ہے لوہا

عرش پہ لے جائے ہمارا عزم اسے
مانا زمین کی گود کا پالا ہے لوہا

یاد ہمیں یہ فیصلہ خود کرنا ہو گا
ہماری ہمت ہے کہ ہمالہ ہے لوہا

●

میں نے کہا کہ تو مری دھرتی کا پھول ہے
اس نے کہا بجا ہے مگر دل ملول ہے
میں نے کہا کہ زلف طرحدار کیا ہوئی
اس نے کہا کہ سر پہ حوادث کی دھول ہے
میں نے کہا زمانہ مخالف ہے کس لیے
اس نے کہا یہ بات ہی کرنی فضول ہے
میں نے کہا لکھاری کا لکھا ہے بے اثر
اس نے کہا کہ ہر جگہ اس کا دخول ہے
میں نے کہا فرنگ بھی جائے اماں نہیں
اس نے کہا یہ قہر خدا کا نزول ہے
میں نے کہا کہ دشمن جاں کے قدم ہی لوں
اس نے کہا، غلط یہ کہاں کا اصول ہے
میں نے کہا کہ خوب ترا حرف حق بجا
اس نے کہا کہ دل سے تجھے بھی قبول ہے؟
میں نے کہا حقیقت عشق بتاں ہے کیا
اس نے کہا کہ یہ دل ناداں کی بھول ہے
میں نے کہا کہ خواب ہے یہ کائنات غم
اس نے کہا کہ اس میں عرض ہے نہ طول ہے
میں نے کہا کہ دور ہے منزل سے کارواں
اس نے کہا کہ رہبر کامل رسول ﷺ ہے

●

احمد صغیر صدیقی، کراچی

راہ چلنے والوں کے مسئلے بہت سے ہیں
منزلیں بہت سی ہیں راستے بہت سے ہیں

سیدھ میں سفر کرنا اس قدر نہیں آساں
دور تک دیشاؤں میں دائرے بہت سے ہیں

وصل کے سوا بھی کچھ خواہشیں ہیں دامن گیر
ہجر کے علاوہ بھی فاصلے بہت سے ہیں

ایک دن یہ چہروں کو توڑ پھوڑ ڈالیں گے
عکس کے تعاقب میں آئینے بہت سے ہیں

بس اسی گلی تک کچھ یہ نہیں رہے محدود
عشق میں دیوانوں کے اب پتے بہت سے ہیں

محمد اسلم گورداسپوری

☆

ہم طرز کہن کے عادی ہیں اور زیست کے ہیں سامان نئے
ہم سیل بلا سے واقف تھے اب آتے ہیں طوفان نئے
تم کیسے آج کی دنیا پر ماضی کو مسلط کرتے ہو
ہر دور کے اپنے مذہب ہیں ہر عہد کے ہیں ایمان نئے
یہ ہم اور آپ تو دنیا کو اک حال میں رکھنا چاہتے ہیں
یہ دنیا تو تب بدلے گی جب آئیں گے انسان نئے
وہ ایک زمانہ تھا جس میں فرہاد کو شہرت حاصل تھی
اب عشق کی ہے تکمیل نئی اب حسن کے ہیں فرمان نئے
یہ ہم اور تم تو دنیا کی محفل سے سرکنے والے ہیں
دنیا تو مسافر خانہ ہے آتے ہیں یہاں مہمان نئے
ہر چند کہ ہم اس الفت کے ہر عہد میں پورے ہیں پھر بھی
تجدید محبت کی خاطر کچھ باندھے ہیں پیمان نئے
ہر اندھے بہرے شعبے کو حساس کہا جاتا ہے یہاں
ہر سوچنے والے شعبے کے ہوتے ہیں یہاں نقصان نئے
انسان کے جیون میں اسلم کچھ اس کے سوا ہوتا کیا ہے
کچھ خواب پرانے ہوتے ہیں کچھ ہوتے ہیں ارمان نئے

روحی کنجاہی

☆

میں آپ اپنی سزا ہوں نہ چاہتے ہوئے بھی
زمانے بھر سے نبھا ہوں نہ چاہتے ہوئے بھی

پہنچ گیا بھی کبھی اس کی آنکھ تک تو وہیں
مثال اشک گرا ہوں نہ چاہتے ہوئے بھی

نہ سیدھے منہ جو کرے بات بھی کبھی مجھ سے
میں اس کو ٹوٹ کے چاہوں نہ چاہتے ہوئے بھی

یہ کیسے خواب دکھائے گئے ہیں خواب میں بھی
میں جاگ جاگ اٹھا ہوں نہ چاہتے ہوئے بھی

کیا قبول نہ دریا نے میری لاش کو بھی
کنارے آن لگا ہوں نہ چاہتے ہوئے بھی

گزر رہے ہیں عجب حادثے دل و جاں پر
کہاں پہ آ کے رکا ہوں نہ چاہتے ہوئے بھی

غریب ہوں تو بڑی عمر والے مردوں سے
میں اپنی بیٹیاں بیاہوں نہ چاہتے ہوئے بھی

میں اپنے پاؤں پہ خود کو کھڑا کروں کیسے
کہ ٹوٹ پھوٹ چکا ہوں نہ چاہتے ہوئے بھی

مجھے پتہ تھا زمانہ ہے اور ہی دھن میں
پہ ساتھ چلتا رہا ہوں نہ چاہتے ہوئے بھی

فلک کی سمت اٹھائے ہیں جب بھی اپنے قدم
زمیں پہ آن گرا ہوں نہ چاہتے ہوئے بھی

وہ دور جا کے بھی روحی مری ہے مجبوری
میں ہجر جھیل رہا ہوں نہ چاہتے ہوئے بھی

●

صدیق شاہد، شیخوپورہ

☆

آپ سے کٹ جائیں تو کچھ بھی نہیں رہ جائے گا
تن بھی اشک یاس میں گھل جائے گا، بہہ جائے گا

کاٹ لوں گا تہ بہ تہ تاریکیوں کا جب پہاڑ
رات کا پچھلا پہر کچھ کان میں کہہ جائے گا

زیست ہے غم کے سمندر میں اتر جانے کا نام
جسم نازک ہی سہی، ہر فیصلہ سہہ جائے گا

جسم کی دیوار جلتے ہی چلے آئیں گے لوگ
ہر کوئی بہر تشفی کچھ نہ کچھ کہہ جائے گا

ہم نے شاہد خاک رسوائی کا وہ پہنا لباس
اپنا قصہ یادگار دائمی رہ جائے گا

●

سید معراج جامی، کراچی

☆

کہیں پر ہم نہیں تھے اور کہیں تھے
سفر طے کر کے بھی آخر وہیں تھے
کتاب عشق کا ہر باب دیکھا
وہ شرح حسن سے بڑھ کر حسیں تھے
مری سانسیں اکھڑنا چاہتی تھیں
وہ میرے جسم کے اتنے قریں تھے
وہ اب آنکھیں دکھانے لگ گئے ہیں
وہ جیسے تھے مگر ایسے نہیں تھے
جو دن میں مجھ سے چھپتے پھر رہے ہیں
مری راتوں کے وہ خلوت نشیں تھے
سراپا آج تک بھولا نہیں ہوں
بدن کے زاویے اتنے حسیں تھے
تمہارا حسن بھی کچھ ڈھل رہا تھا
ہمارے پاس بھی دعوے نہیں تھے
فلک کی سیر کر کے آ گئے ہیں
اگرچہ ہم تو پابند زمیں تھے
مجھے معلوم تھا بے جان تھے وہ
مگر دعوے تمہارے دل نشیں تھے
ہمارے زعم کے جتنے تھے پیکر
ہماری سوچ سے بڑھ کر حسیں تھے
ہماری کھوج میں دنیا اگر تھی
تو کیا ہم بھی کسی دل کے مکیں تھے
انہیں اندر سے بھی دیکھا ہے جامی
تری محفل میں جو مسند نشیں تھے

●

سوہن راہی، لندن

اب کے پھولوں میں کوئی باس نہیں
وہ مرے پاس ہو کے پاس نہیں
لوگ تو عمر بھر ہی پیاسے رہیں
چند لمحوں کی پیاس پیاس نہیں
عمر بھر زندگی سفر میں رہے
اک جگہ رہنا اس کو راس نہیں
ہم بھی طرزِ سخن بدل لیتے
کیا کریں دل ادا شناس نہیں
سرد لمحے ہیں وقت ٹھہرا ہوا
مدھر رت میں بھی کوئی باس نہیں
زندگی موت اس کے گھر سے ہے
حکم ہے حکم التماس نہیں
تیرے حالات کی جو تلخی پیئں
مرے حرفوں میں وہ مٹھاس نہیں
زندگی ہے نہیں بھی ہے راہی
ساتھ کب تک رہے قیاس نہیں

●

انوار فیروز

☆

یاد میں تیری ہر دم رہنا اچھا لگتا ہے
کام یہی بس مجھ کو کرنا اچھا لگتا ہے
ہم سچے ہیں بات کھری ہم کرتے ہیں
تم کو منظر دھندلا دھندلا اچھا لگتا ہے
جب سرما کی راتوں میں اک جنگل ہو تنہائی کا
چپ کی چادر اوڑھ کے سونا اچھا لگتا ہے
دنیا کے غم چن کر اپنی جھولی بھرتا ہوں
اوروں کو سکھ بانٹتے رہنا اچھا لگتا ہے
گرچہ رات کو اکثر دیر سے سوتا ہوں
پھر بھی صبح سویرے اٹھنا اچھا لگتا ہے
آگ اور پانی ساتھ رہیں ممکن تو نہیں
اس کی ہمراہی میں چلنا اچھا لگتا ہے
میں انوار ہوں روشن ہر دم رہتا ہوں
بن کے دیپک مجھ کو جلنا اچھا لگتا ہے

●

ڈاکٹر ندیم الحسن ندیم

☆

بڑا کٹھن ہے کسی کی اماں میں رہنا
تمام عمر ہی اک امتحان میں رہنا

چلو کہ ڈوب ہی جائیں یا پار لگ جائیں
ہمیں قبول نہیں درمیان میں رہنا

غموں کی دھوپ کسی دن جلا بھی سکتی ہے
یہ سوچ کر ہی کسی سائبان میں رہنا

یہ دل سے دل کے تعلق کا استعارہ ہے
کسی کا روز کسی کے دھیان میں رہنا

یہ بات صرف پرندوں کو زیب دیتی ہے
زمیں سے ہو کے الگ آسمان میں رہنا

یہ ایک بات بڑے کام کی ہے دنیا میں
یقیں کے ساتھ کسی کے گمان میں رہنا

کسی سے بولتے دیوار و در نہیں ہیں ندیم
بڑا ستم ہے اکیلے مکان میں رہنا

●

☆

کمال ضبط کو خود آزمانا چاہتا ہوں
انا کے زور سے تجھ کو گرانا چاہتا ہوں

تیرے خیال میں الجھے سوال کی صورت
کسی بہانے تجھے یاد آنا چاہتا ہوں

گزر گیا ہے زمانہ کسی کی یادوں میں
تو بھول جانے کو بھی اک زمانہ چاہتا ہوں

ہمارا جلتے ہوئے آنسوؤں کی صورت میں
جو لٹ چکا ہے کہیں وہ خزانہ چاہتا ہوں

جو مسکراتے ہیں شاخوں پہ صبح دم جاناں
میں تیری راہ میں وہ گل سجانا چاہتا ہوں

زمانے والوں کو شاید برا لگے پھر بھی
تکلفات کے پردے گرانا چاہتا ہوں

جیسے دھوپ میں آئینہ رکھ دیا ہو ندیم
میں ایک نقش وفا یوں بنانا چاہتا ہوں

●

اسد اعوان

☆

ہمیں نہ دیکھے کوئی بھی حجاب مانگتے ہیں
گنہگار بھی شوق ثواب مانگتے ہیں

ہمیں کہاں ہے تمنائے سیم و زر ہم تو
جہاں میں رونق حسن شباب مانگتے ہیں

غریب شہر کو کب تک وہ اذیتیں دے گا
امیر شہر سے اس کا جواب مانگتے ہیں

جہاں میں شہرہ تھا تیری تو بے نیازی کا
مگر یہ داور محشر حساب مانگتے ہیں

ہر اک نگاہ میں حرص و ہوس ہے جان اسد
یہ لوگ خود پہ ہمیشہ عذاب مانگتے ہیں

●

مسعود تنہا، سرگودھا

☆

جیون میں اک سپنا ہے
کب وہ میرا اپنا ہے

زخم جگر پہ گہرا ہے
اس سے پھر بھی ناتا ہے

روشن روشن چہرے ہیں
صرف نظر کا دھوکہ ہے

مت پوچھو کہ دل میرا
کس کی یاد میں روتا ہے

دنیا جس پہ ہنستی ہے
تیرا میرا قصہ ہے

اب تو میرے اندر کا
موسم بدلا بدلا ہے

تیرا یہ مسعود تنہا
صحرا صحرا پھرتا ہے

●

نیر کمال

دشت وفا میں ایسے الم سے گزر گیا
بکھرا ہزار بار بکھر کر سنور گیا

میں رہگذر سے پوچھ رہا ہوں یہ بار بار
وہ جان من، وہ جان دل و جاں کدھر گیا

شاید کہ میری بات کا تجھ کو نہ ہو یقیں
میں تیری جستجو میں جہاں سے گزر گیا

غم کی کوئی کسک تھی کہ یادوں کا تھا ملال
جو لمحہ بھی عذاب تھا آخر گزر گیا

چپ چاپ سر جھکائے ہوئے ہیں یہ چارہ گر
شاید کہ درد روح کے اندر اتر گیا

اشعار اپنے دل کے لہو سے نکھار کر
نیر تیری غزل کا تو چہرہ نکھر گیا

●

محمد عالمگیر خیالی

☆

سکوں دیتی تھی جو پہلے وہ تنہائی نہیں ہوتی
طبیعت اب چمن کی بھی تمنائی نہیں ہوتی
فلک سے آنے والی یہ صدا میں صاف سنتا ہوں
جو دو رنگی پہ ہو قائم شناسائی نہیں ہوتی
گل دستار بن کر بھی رہے پاؤں کی ٹھوکر میں
خوشامد کرنے والوں کی پذیرائی نہیں ہوتی
نظارہ اصلی پھولوں کا ہی گو نقلی بھی دیتے ہیں
مگر خوشبو نہیں ہوتی وہ رعنائی نہیں ہوتی
پس دانہ جو پنہاں جال بھی دیکھے وہ بینائی
جو دانوں ہی پہ گر جائے وہ بینائی نہیں ہوتی
جہالت کی کمائی کھانے والوں نے کہا مجھ سے
کہ سچی بات کہنا بھی تو دانائی نہیں ہوتی
دل غیور سینے میں سے جس کا ساتھ دیتا ہے
عدو کے سامنے وہ آنکھ شرمائی نہیں ہوتی
تڑپتا ہے نہ روتا ہے نہ بچتا ہے حوادث سے
جو زندہ ہو نظر اس کی یوں پتھرائی نہیں ہوتی
سنو لوگو کسی بیداد دل کو رہنما چن لو
کہ مردوں سے تو قوموں کی مسیحائی نہیں ہوتی
جہاں اپنا ہی سب کچھ ہو جہاں خیالی سب اپنے ہوں
زمیں وہ اپنوں ہی کے خوں سے نہلائی نہیں ہوتی

●

طالب انصاری

☆

میرے ساتھ ساتھ سراب ہے مرا خواب ہے
یہ جو عمر بھر کا عذاب ہے مرا خواب ہے

کبھی بجھ گیا کبھی اپنے آپ ہی جل اٹھا
یہ چراغ جو سر آب ہے مرا خواب ہے

ذرا دیکھ کے تو قدم بڑھا مرے بے خبر
ترے پاؤں میں مرا خواب ہے مرا خواب ہے

اسی روشنی میں گزارتا ہوں سیاہ شب
یہ جو تر بہ تر تب و تاب ہے مرا خواب ہے

اسی بوجھ کو لیے گھومتا ہوں خوشی خوشی
سر چرخ غم جو سحاب ہے مرا خواب ہے

کوئی پوچھ لے کہ اداسیوں کا سبب ہے کیا
تو یہ مختصر سا جواب ہے مرا خواب ہے

●

سید امتیاز احمد

☆

اس سے کچھ کم میں کوئی اس سے سوا میں گم ہے
اپنا دل اک نگہ ہوش ربا میں گم ہے

کوئی ثابت نہیں ایسا کہ ہو بے خوف شکست
جو بھی موجود ہے اک وہم فنا میں گم ہے

میری دنیا بھی کبھی میرے خدا مجھ کو ملے
میری دنیا، جو ترے ارض و سما میں گم ہے

کام مشکل نہیں گر حوصلہ کر لے کوئی
بات چھوٹی سی ہے بس ما و شما میں گم ہے

وہ بہت دور نہیں گر اسے ڈھونڈا جائے
وہ اسی شب اسی تاریک فضا میں گم ہے

●

ہارون الرشید تبسم

☆

جو بات دل کی ہے دل میں چھپائے پھرتا ہوں
یہ ایک بار امانت اٹھائے پھرتا ہوں

فصیل وقت میں الجھا رہا مرا دامن
سکون قلب کی دولت لٹائے پھرتا ہوں

عطا ہوئے ہیں جو احباب کی وساطت سے
وہ سارے زخم بدن پر سجائے پھرتا ہوں

نجانے چھین لیں کس نے لطافتیں میری
یہی وہ غم ہے جو دل میں بسائے پھرتا ہوں

اندھیری رات کے دامن میں زندگی گزری
سحر کی آس میں سب کچھ گنوائے پھرتا ہوں

یہ تو ہے جس نے فراموش کر دیا مجھ کو
یہ میں کہ یاد گلے سے لگائے پھرتا ہوں

●

اے جی جوش

☆

یوں میرے نامے کا جواب آیا
دھند میں لپٹا آفتاب آیا

آنکھ سورج کو بھی حیرانی پڑی
سامنے جب وہ ماہتاب آیا

میرا آنگن مہک مہک اٹھا
جب وہ کھلتا ہوا گلاب آیا

دیکھ پایا نہ شوخیاں اس کی
دل کو کچھ اس قدر حجاب آیا

ہم سمندر کی جستجو میں تھے
اور حصے میں اک سراب آیا

جوش جلووں کی تاب لا نہ سکا
یوں اچانک وہ بے نقاب آیا

●

جمیل یوسف

پرتو روہیلہ کی ''مشکلات غالب''

غالب بھی اپنی نوعیت کا عجیب شاعر ہوا ہے۔ عبدالرحمٰن بجنوری نے کہا تھا۔ ''ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں، ایک مقدس وید دوسری دیوان غالب''۔ مگر مجھے یقین ہے وید کی کتابی صورت میں منظر عام پر آنے کے ڈیڑھ سو سال کے اندر اندر اس کے متعلق اتنی کتابیں نہیں لکھی گئی ہوں گی جتنی پچھلے ڈیڑھ سو سال میں دیوان غالب پر لکھی گئی ہیں۔ ایک وید پر ہی کیا منحصر ہے دنیا کے شعری ادب پر اگر نظر ڈالی جائے تو میرا خیال ہے کوئی شاعر اس باب میں غالب کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ معلوم نہیں کس الہامی لمحے میں نواب میرزا اسد اللہ خان غالب نے اپنا تخلص غالب رکھا تھا، وہ بلاشبہ سب شاعروں پر غالب چلا آتا ہے۔ جوں جوں زمانہ آگے بڑھ رہا ہے اس کا غلبہ بھی بڑھ رہا ہے اور اپنے بارے میں اس کا یہ دعویٰ حرف بحرف سچ ثابت ہو رہا ہے۔

ع شہرِ شعرم بہ گیتی بعد من خواہد شدن

آج غالب کے شہر دہلی میں اردو اور فارسی جو غالب کا ذریعہ اظہار تھیں، اجنبی اور غریب الدیار ہو کر رہ گئی ہیں۔ ان کا نام و نشان مٹایا جا رہا ہے مگر غالب کا نام روشن سے روشن تر اور اس کا نشان بلند سے بلند تر ہو رہا ہے۔ اکبر، شاہ جہاں، اورنگزیب جیسے عظیم شہنشاہوں کے سکے کب کے متروک ہو کر قصہ پارینہ بن چکے، مگر اس شہنشاہ سخن کے نام اور کلام کا سکہ نہ صرف چل رہا ہے بلکہ اس کی قدر و قیمت میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے اور بین الاقوامی سطح پر بھی اس کی ساکھ بڑھ رہی ہے۔ بھارت میں اسلامی تہذیب و تمدن کے آثار بابری مسجد کی طرح ڈھائے اور مٹائے جا رہے ہیں، حکومت ہند ان کی حفاظت نہیں کرتی مگر غالب کے نام و نشان اور اس کے آثار کی حفاظت و نگہداشت کرنے پر وہ مجبور ہے کیونکہ جو علمی و ادبی و ثقافتی وفد بیرون ملک سے دہلی پہنچتا ہے وہ حکومت کے ایوانوں کی غلام گردشوں میں گھومنے کی بجائے غالب کے آثار و نشانات کا متلاشی ہوتا ہے۔ وہ بھارتی صدر سے زیادہ غالب سے ملاقات کرنے کی خواہش کا اظہار کرتا ہے جو اب بھی اپنی وفات کے ۱۳۶ سال بعد اپنے مزار سے ملحقہ غالب لائبریری کے اوپر میوزیم میں پیچوانی حقے کی ''نے'' ہاتھ میں لیے بیٹھا ہے اور ہر آنے والے سے خراج عقیدت وصول کر رہا ہے۔

خیر یہ مشکل تو غالب نے بھارتی حکومت کے لیے پیدا کر رکھی ہے مگر اپنے عقیدت مندوں کے لیے بھی جو ہر چند کہ سخن فہم بھی ہیں اور طرفدار بھی۔ غالب کی پیدا کردہ مشکلات کچھ کم نہیں ہیں بلکہ یہ مشکلات گوناگوں اور روز افزوں ہیں۔ ٹی ایس ایلیٹ نے کہا تھا کہ

ہر عہد کلاسیک کو اپنے تناظر میں پڑھتا اور سمجھنے کی کوشش کرتا ہے اور اس سے نئے نئے معانی اور مطالب اخذ کرتا ہے۔ اس طرح کسی کلاسیکی ادب پارے کی تفہیم کبھی حتمی اور قطعی طور پر مکمل نہیں ہو سکتی۔ غالب نے اسی خیال کا اظہار اپنے شعر میں کیا ہے۔

دل حسرت زدہ تھا مائدہ لذت درد
کام یاروں کا بقدر لب و دنداں نکلا

غالب نے شہنشاہ سخن کا تاج اپنے سر پر سجانے کے بعد سب سے پہلی مشکل تو خود اپنے لیے پیدا کی۔
بقول غالب:

مشکل ہے ز بس کلام میرا اے دل
سن سن کے اسے سخنوران کامل
آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش
گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

اہل ذوق نے جب کلام غالب کو سمجھنے میں دشواریاں محسوس کیں اور تنگ آ کر اشعار کو بے معنی قرار دیا تو غالب نے یار لوگوں کے اس ردعمل کا جواب اپنی شاہانہ بے نیازی سے دیا اور فرمایا۔

نہ ستائش کی تمنا، نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

ہم عصروں کو سخن فہمی کی مشکلات میں مبتلا دیکھ کر غالب لطف اندوز ہوتا رہا، اسے اپنی مشکل پسندی پر پیار آنے لگا۔ کہتا ہے:

گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے
خوش ہوں کہ میری بات سمجھنا محال ہے

کسی قسم کا کوئی معذرت خواہانہ رویہ اختیار کرنے کے بجائے غالب نے الٹا اہل سخن اور اہل ذوق کو کھلا چیلنج دے دیا۔

آگہی دام شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہے اپنے عالم تقریر کا

عام قاعدہ تو یہ ہے کہ اس طرح کے شاعر کو جسے اپنی مشکل پسندی پر اتنا فخر و ناز ہو در خور اعتنا ہی نہ سمجھا جائے اور اس کے کلام کو ایک طرف رکھ دیا جائے، قاری اسے اس قابل ہی نہ سمجھے کہ اس کا مطالعہ کیا جائے۔ غالب کسی حکیم کا لکھا ہوا نسخہ تو تھا نہیں جس کا پڑھنا اور سمجھنا لازم تھا۔ مگر یہ بھی تاریخ ادب کا عجیب واقعہ ہے کہ غالب کا اسلوب یعنی جتنا اجنبی اور اس کا تخیل جتنا گریزاں تھا شعر و سخن کے

دیوانے اتنے ہی اشتیاق سے اس کی طرف لپکے۔ کیا غالب کی شاعری کوئی محبوبہ دلنواز تھی کہ جس قدر اپنے چاہنے والوں سے دامن بچاتی تھی وہ اسی قدر اس کے دامن گیر ہوتے چلے گئے وہ جس قدر لفظ و معنی کے حجاب اپنے اوپر ڈالتی گئی مشتاقان سخن کا تجسس اتنا ہی بڑھتا چلا گیا۔ آخر غالب کو وہ شہرت و مقبولیت اور پذیرائی ملی جس کی مثال نہیں ملتی حالانکہ اس کے اشعار کی پیچیدگی اور اس کے افکار کی پراسراریت بدستور قائم و دائم ہے اور اس پیچیدگی اور پراسراریت کی گتھیاں سلجھانے کی کوششیں ہنوز جاری ہیں۔ ان کوششوں کا آغاز غالب کی زندگی میں ہی ہو گیا تھا بلکہ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ اس سلسلے کا آغاز خود غالب نے کیا تھا۔ ہوا یوں کہ غالب کے پرستار اسے خط لکھ لکھ کر اس کے مشکل اشعار کے معنی پوچھنے لگے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ خطوط غالب میں متعدد اشعار کی تشریح و توضیح ہمیں خود غالب کے الفاظ میں ملتی ہے۔ مگر اس کا کیا کیا جائے کہ مشتاقان سخن غالب کی تشریح و توضیح سے بھی مطمئن نہ ہوئے۔ اس کی وجہ وہی ہے جو خود غالب نے ان الفاظ میں بیان کی ہے۔

گنجینہ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے
جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

ایک تو معنی کا گنجینہ ہی کچھ کم وقت طلب نہ تھا پھر وطیرہ کی جگہ اس پر طرہ یہ کہ اس گنجینے کا ایک طلسم بھی ہے جس نے گنجینے کو مقفل کیا ہوا ہے۔ کئی الفاظ کا دروبست ایسا ہے کہ ان میں سے بیک وقت مختلف بلکہ بعض اوقات تضاد معنی نکل رہے ہیں۔ اپنی اسی کارستانی سے اکتا کر غالب نے ایک دفعہ یہاں تک کہہ دیا۔

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

مگر اہل ذوق کو کلام غالب کے مطالب کی تفہیم و توضیح اس قدر مرغوب خاطر ٹھہری کہ انہوں نے اسی شغل کو اپنا وطیرہ بنا لیا۔ غالب کے بعد اس کے کلام کا دوسرا بڑا مفسر الطاف حسین حالی ہے۔ حالی نے یادگار غالب میں غالب کے بہت سے اشعار کے معانی بڑے دلپذیر انداز میں بیان کئے ہیں۔ حالی کے بیان نے شعر و سخن سے دلچسپی رکھنے والے حلقوں میں مطالعہ غالب کا روز افزوں ذوق و شوق پیدا کر دیا۔ غالب کا نام اور کلام جتنا پھیلتا گیا اس کے دیوان کی شرحیں لکھنے والوں کا سلسلہ بھی دراز ہوتا چلا گیا۔

ڈاکٹر نثار احمد فاروقی کی تحقیق کے مطابق غالب کے اشعار کی شرح سب سے پہلے غالب کے ایک ہم عصر اور شاگرد درگاہ پرشاد نادر نے غالب کی زندگی میں ہی لکھی مگر یہ پورے دیوان کی شرح نہ تھی۔ پہلی کتاب جو شرح دیوان غالب کے طور پر ۱۸۹۳ء میں چھپی، عبدالعلی والہ کی ہے مگر یہ شرح اختصار بلکہ بہت زیادہ اختصار کے باعث قارئین میں مقبول نہ ہو سکی۔ عبدالعلی والہ کی تشریح کا انداز کچھ یوں ہے۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

کی تشریح وتفسیر میں صرف اتنا لکھا ہے۔

''پیرہن کاغذی: فریادیوں کا لباس، جو قدیم میں دستور تھا۔ یہ کنایہ ہے عجز و بے چارگی وتظلم زاری سے۔''

غالب کے شارحین میں غالب کو چھوڑ کر پہلا قابل ذکر اور معتبر نام الطاف حسین حالی کا ہی ہے۔ اب تک کلام غالب کی تشریح میں کم وبیش ایک سو دس تصنیفات منظر عام پر آ چکی ہیں۔ ان تصنیفات کے مصنفین میں چند ایک مشہور ومعروف نام یہ ہیں۔ الطاف حسین حالی، حسرت موہانی، سعید الدین احمد، بے خود دہلوی، منشی پریم چند، نظم طباطبائی، عبدالباری آسی، سہا بھوپالی، آغا محمد باقر، احسان دانش، جوش ملیسانی، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، غلام رسول مہر، نیاز فتحپوری، ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، نشتر جالندھری، اثر لکھنوی، عاصی کرنالی، یوسف سلیم چشتی، ڈاکٹر یوسف حسین، شمس الرحمٰن فاروقی، شان الحق حقی، مشکور حسین یاد اور پرتو روہیلہ۔

جن ادباء وشعراء کے اسمائے گرامی اوپر درج کئے گئے ہیں ان میں سے بعض نے غالب کے سارے دیوان اردو کی شرح لکھنے لکھنے کے بجائے چند منتخب اشعار کی تشریح کی ہے جیسے یادگار غالب میں حالی نے چند اشعار کو لیا ہے۔ ان میں سے اکثر اشعار کو مشکلات غالب میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔ زیادہ تر شعر ایسے ہیں جو آسانی سے سمجھ میں آ جاتے ہیں۔ اسی طرح ڈاکٹر خلیفہ، عبدالحکیم نے بھی چند اشعار چن کر ان کے مطالب کی غواصی کی ہے۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم نے البتہ اتنی خوبی سے غالب کے شعروں کی تشریح وتوضیح کی ہے کہ باید وشاید۔ اسی طرح اثر لکھنوی کی کاوش بھی قابل ستائش ہے۔ اثر لکھنوی نے بڑے دل پذیر اور واضح انداز میں غالب کے بعض شعروں پر روشنی ڈالی ہے۔ غلام رسول مہر نے نوائے سروش اور آغا محمد باقر نے بیان غالب کے نام سے دیوان غالب کی مکمل شرحیں قلمبند کی ہیں۔ آغا محمد باقر کی کتاب غالب کو بڑی شہرت ومقبولیت ملی ہے اس کی خوبی یہ ہے کہ مصنف نے بعض اہم شارحین مثلاً حسرت طباطبائی، بیخود، آسی شوکت میرٹھی اور سعید کی آراء بھی جا بجا شامل کتاب کی ہیں اور پھر اپنی رائے بھی دی ہے۔ بیان غالب پہلی دفعہ ۱۹۳۹ء میں چھپی۔ اب تک اس کے پچاس سے اوپر ایڈیشن نکل چکے ہیں۔

جہاں تک غالب کے مشکل اردو اشعار کا تعلق ہے سب سے پہلے نیاز فتح پوری نے خصوصی طور پر ان پر قلم اٹھایا اور اپنی کتاب کا نام ''مشکلات غالب'' رکھا مگر نیاز فتح پوری کی کتاب قاری کو زیادہ متاثر نہیں کرتی۔ اپنے علمی تبحر کا رعب ڈالنے میں نیاز فتح پوری اکثر اوقات شعر کے متن سے بہت آگے نکل جاتے ہیں اور ان کی تشریح وتوضیح دور از کار اور بعید از قیاس ہو جاتی ہے۔ یہی حال پروفیسر مشکور حسین یاد اور شمس الرحمٰن کا ہے۔ قاری پہلے سے زیادہ الجھ جاتا ہے اور اسے واضح طور پر کچھ پتہ نہیں چلتا کہ خود شاعر کیا کہنا چاہتا ہے۔

غالب کے اشعار کی تشریح وتوضیح میں اوپر دی ہوئی فہرست میں آخری نام پرتو روہیلہ کا ہے۔ پرتو روہیلہ کی کتاب ''مشکلات غالب'' اس سلسلے کی تازہ ترین کڑی ہے جو تقریباً دو سال پہلے منظر عام پر آئی ہے۔ یہ ایک اہم کتاب ہے۔ میں حیران ہوں کہ نقادان ادب اور تبصرہ نگاروں نے اس کتاب کا نوٹس کیوں نہیں لیا۔ پرتو روہیلہ نے اپنی کتاب کا نام ''مشکلات غالب'' کے پیش نظر مصنف کا دعویٰ یہ ہے کہ ''مشکلات غالب'' کے موضوع پر کتاب اس طرح لکھتے ہیں۔

ع دیکھیں، اس طرح سے کہتے ہیں سخن ور سہرا

پرتو روہیلہ کے بارے میں جناب ڈاکٹر عبدالوحید قریشی صاحب رقمطراز ہیں۔

''پرتو روہیلہ ایک کہنہ مشق شاعر ہی نہیں فارسی زبان پر عالمانہ دسترس رکھنے والے عالم بھی ہیں۔ ان کے ذوق نظر سے غالب فہمی کی روایت میں بیش از بیش اضافہ ہوا ہے۔ وہ لفظوں کی باریکیوں کو جانتے ہیں اور اپنے مطالعے کے زور پر غالب کے طرز احساس کو گرفت میں لے سکتے ہیں یہی ان کا کمال فن ہے۔''

مشفق خواجہ فرماتے ہیں۔

''پرتو روہیلہ نے غالب شناسی کے لیے جو مشکل اور دشوار گذار راستہ اختیار کیا ہے اس پر وہ بڑی سلامت روی سے گامزن ہیں۔ اس کی کوئی دوسری مثال موجود نہیں۔''

اپنی کتاب ''مشکلات غالب'' میں جناب پرتو روہیلہ نے صرف ان اشعار کو لیا ہے جن کے مطالب ومعانی کی تفہیم عام قارئین کے لیے مشکل ہے۔ غالب کے ہاں ایسے اشعار کم نہیں ہیں۔ ''مشکلات غالب'' میں جن اشعار کی تشریح کی گئی ہے ان کی تعداد ۳۹۶ ہے۔ پرتو روہیلہ کی کتاب نہ صرف اشعار کی تعداد کے لحاظ سے غالبیات میں منفرد اور ممتاز ہے بلکہ جس انداز اور خوبی اور جس وضاحت اور شرح وبسط سے پرتو روہیلہ نے ان اشعار کے مطالب ومعانی بیان کئے ہیں اس کی مثال کہیں اور نہیں ملتی۔ میرے اس دعوے کا تقاضا یہ ہے کہ مشتے از خروارے کے طور پر ان کی کتاب سے چند اشعار کی تشریح یہاں نقل کی جائے کیونکہ مشک آن ست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید۔

غالب کے دیوان کا پہلا شعر ہے۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے یہ دیکھا جائے کہ باقی شارحین نے اس کی شرح میں کیا لکھا ہے۔

غالب کے سب سے پہلے شارح عبدالعلی والہ نے صرف اس قدر لکھا ہے۔

"پیرہن کاغذی: فریادیوں کا لباس، جو قدیم میں دستور تھا۔ یہ کنایہ ہے۔ عجز و بے چارگی و تظلم و زاری سے۔"

طباطبائی لکھتے ہیں۔

"یہ شعر بے معنی ہے۔ کاغذی پیرہن کا رواج نہ دیکھا نہ سنا۔ (پھر خود ہی فرماتے ہیں) لیکن کاغذی پیرہن کے ثبوت میں یہ شعر پیش کئے جاسکتے ہیں۔

تا کہ دست قد راز دست تو بر بود قلم
کاغذی پیرہن از دست قدر باد مرا

(بابا فغانی)

کاغذی جامہ بپوشد و بدرگہ آمد
زادۂ خاطر من تابد می داد مرا

(کمال اسمٰعیلی)

سعید رقمطراز ہیں۔

"انسان کی بے بود ہستی اور کشاکش حیات کا نقشہ الفاظ میں کھینچا ہے۔ حاصل شعر کا یہ ہے کہ ہستی خواہ وہ کسی چیز کی بھی ہو، باعث تکلیف و رنج ہے حتیٰ کہ تصویر بھی جو کہ صرف ایک ہستی محض ہے بزبان حال فریاد کر رہی ہے کہ مجھ کو ہست کر کے کیوں رنج ہستی میں مبتلا کیا جیسا کہ اس کی کاغذ پیرہنی سے ظاہر ہے۔"

آسی بیان کرتے ہیں۔

"مولانا روم کے اس مفہوم کو اس شعر میں ادا کیا گیا ہے۔"

بشنواز نے چوں حکایت می کند
وز جدائی ہا شکایت می کند
کز نیستاں تا مرا ببریدہ اند
از نفیرم مرد و زن نالیدہ اند

مطلب یہ ہے کہ اصل سے جدا ہونے کے بعد اضطراری کیفیت پیدا ہونا ضروری ہے۔ نے جب نیستاں سے جدا ہوتی ہے تو اس میں فریاد کرنے کی قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی طرح جب تصویر کاغذ پر بنائی جاتی ہے تو وہ اپنے کاغذی لباس کی بدولت نقاش کی شوخی تخلیق کی زبان حال سے فریاد کرنے لگتی ہے۔ بیخود کہتے ہیں۔

"ہر پیکر تصویر سے مراد جملہ حیوانات جمادات اور نباتات سے ہے اور یہ ساری چیزیں فنا ہونے والی ہیں۔ جب موجودات عالم کا یہ حال ہو تو نقش ہستی کا اپنی بے ثباتی پر فریادی ہونا شاعر کے تخیل بلند اور غیر معمولی جدت فکر کا ثبوت کامل ہے۔"

خود میرزا غالب اس شعر کی شرح ایک خط میں یوں بیان کرتے ہیں۔

"ایران میں رسم ہے، کہ داد خواہ کاغذ کے کپڑے پہن کر حاکم کے سامنے جاتا ہے، جیسے مشعل دن کو جلانا، خون آلود کپڑا، بانس پر لٹکا کر لے جانا۔ پس شاعر خیال کرتا ہے کہ نقش کس کی شوخی تحریر کا فریادی ہے، جو صورت تصویر ہے۔ اس کا پیرہن کاغذی ہے یعنی ہستی اگرچہ مثل تصاویر، اعتبار محض ہو، موجب رنج و ملال و آزار ہے۔"

اب اس شعر کی تشریح پرتو روہیلہ کے الفاظ میں ملاحظہ ہو۔

"دیوان کا پہلا شعر ہے جو روایت کے مطابق حمد یہ ہوا کرتا تھا لیکن غالب کی جودت طبع نے عام روش اختیار کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اور ان کے انفرادیت نے مجبور کیا کہ یہاں بھی انوکھا طرز اظہار اختیار کریں، چنانچہ یہاں ثناء کی جگہ شکایت اور ایمان سے زیادہ تشکیک نظر آتی ہے۔

شعر کی نثر اس طرح ہوگی۔ نقش کس کی شوخی تحریر کی فریاد کر رہا ہے کہ ہر پیکر تصویر نے کاغذی پیرہن پہن رکھا ہے۔ روایت ہے کہ زمانہ قدیم میں کاغذی پیرہن تظلم و زاری کے لیے فریادی کا لباس ہوا کرتا تھا۔ اب اگر نقش سے تمام مخلوقات عالم مراد لیں تو مطلب یہ ہوگا کہ مخلوقات عالم میں سے ہر ایک زبان حال سے فریادی ہے کہ میں کس کی شوخی تحریر کا نتیجہ ہوں۔ چونکہ ہر نقش کا وجود حقیقی نہیں اعتباری ہے اس لیے اس کو تصویر کہا ہے اسی لیے وہ فریادی بھی ہے کہ اس نے کاغذ کا سا ناپائیدار لباس پہن رکھا ہے۔ اب نقش کی فریاد کے تین اسباب ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ مصور ازل نے (ذہن میں یہ بات رکھیں کہ اللہ کی صفات میں ایک صفت یہ بھی ہے) بغیر اس کی مرضی کے اس کو تخلیق کیا۔ دوسرے یہ کہ اس کو کل علاحدہ کر کے فراق سے دوچار کیا اور تیسرے یہ کہ اس کو عین راہ فنا میں بٹھا دیا۔ سو نقش، بصورت کاغذ کا لباس پہنے یہ فریاد کر رہا ہے کہ مجھے مبتلائے ہستی کس نے کر دیا۔

یہاں مصرعہ اولی کا انتہائی بامعنی فقرہ "کس کی" ہے۔ باوجود اس کے کہ بہت سے شارحین اس کو استعجابیہ بتاتے ہیں کہ میرا یہ خیال ہے کہ یہ استفہامیہ ہے اور غالب کی عقلیت پسندی پر دلالت کرتا ہے۔ یہی اس شعر کی خوبی ہے اور فریاد کا سبب زاری بھی کہ نقش کو یہ نہیں معلوم کہ کس ان دیکھے ہاتھ نے اسے بغیر اس کی مرضی کے لوح حیات پر نقش کر دیا۔ اس کی بڑی فریاد تو یہی ہے کہ وہ اب دادرسی کے لیے جائے تو کس کے پاس اور اس جبر مسلسل کا اگر ازالہ کرے گا تو کون؟

مختلف شارحین نے شوخی کے مختلف معنی لیے ہیں جن میں سے ایک خوبی اور خوش نمائی بھی ہے لیکن میں سمجھتا ہوں یہ لفظ عام اردو اور فارسی معنی میں بہت مناسب معلوم ہوتا ہے یعنی شرارت، بذلہ سنجی، مذاق۔ عام ایرانی شوخی کردن کے معنی مذاق کرنے کے لیے

ہیں۔ یہ لفظ یہاں بھی بعینہ ان ہی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

یہاں شوخی تحریر کے معنی آپ پریکٹیکل جوک (Practical Joke) لے سکتے ہیں۔

اس پس منظر میں اگر ہم اس لفظ نقش کے کینوس (Canvas) کو تھوڑا سا سمیٹ کر صرف انسان تک محدود کر دیں (وہ اس وجہ سے کہ دوسری مخلوقات کی زبان ہم نہیں سمجھتے) تو اس شعر کی بڑی خوبصورت تمثیل سامنے آتی ہے۔ بچہ روتا ہوا اس عالم امکان میں آتا ہے۔ بوقت ورود اس کا لباس بھی فریادی کا لباس ہوتا ہے اور یہ نقش زبان بے زبانی سے اس مصور ازل کے جبر کی فریاد کر رہا ہوتا ہے جس نے اس کو بغیر اس کی مرضی کے قرب الٰہی سے محروم کیا اس فنا آشنا زندگی میں مبتلا کر دیا۔ اس پس منظر میں نقش کی یہ فریاد بھی اضطراری، بے اختیاری اور جبلی ہے۔ اس نے سے زیادہ جبلی جو جدائی کی شکایت کرتی ہے۔

بشنواز نے چوں حکایت می کند

وز جدائی ہا شکایت می کند

اب دیکھئے غالب کی انفرادیت۔ یہ حمد کا شعر ہے لیکن ثنا کی جگہ شکوہ اور ایمان کی جگہ تشکیک۔ اور بات یہیں پر ختم نہیں ہوتی۔ نقش اس پورے نظام تخلیق وتکوین پر معترض ہے۔ جس نے اس کی مرضی کے بغیر اس کے گلے میں یہ طوق ہستی ڈال دیا۔ نقش اس کی ہی تو فریاد کر رہا ہے بھلا یہ عملی مذاق میرے ساتھ کس نے کیا ہے؟

علامہ اقبال پر اس شعر کے معنی پورے طور پر روشن تھے اس لیے انہوں نے کہا تھا۔

مجھ کو پیدا کر کے اپنا نکتہ چیں پیدا کیا

نقش ہوں اپنے مصور سے گلہ رکھتا ہوں میں

یہاں اس شعر کی تشریح اختتام پذیر ہوتی ہے۔

اب صرف دو اور اشعار ایسے ملاحظہ ہوں جن کی صحیح تفہیم وتشریح میں جملہ شارحین بشمول مشاہیر ادب ناکام رہے ہیں مگر پرتو روہیلہ نے ان مشکل اشعار کو ادب کے عام قاری کے لیے آئینہ کر دیا۔

کیوں اندھیری ہے شب غم ہے بلاؤں کا نزول

آج ادھر ہی کو رہے گا دیدۂ اختر کھلا

معروف غالب شناسوں اور نقادان ادب نے اس شعر کے مندرجہ ذیل مطالب بیان کیے ہیں۔

نیاز فتح پوری: پہلے مصرعے کا پہلا ٹکڑا سوال ہے "کہ شب غم اتنی تاریک کیوں ہے" خود ہی اس کا جواب دیتا ہے کہ شب غم میں آسمان سے بلائیں نازل ہو رہی ہیں اور ان بلاؤں کا تماشا دیکھنے کے لیے دیدۂ اختر اوپر ہی کی طرف مائل ہے۔ یہ شعر دور از کار تخیل

کے سوا کچھ نہیں۔

بیخود دہلوی: شب غم کی تکلیفوں سے گھبرا کر اپنے دل سے سوال ہے کیا سبب ہے رات اتنی اندھیری کیوں ہے۔ پھر خود ہی سوچ کر جواب دیتے ہیں۔ بلاؤں کا نزول ہے یعنی مجھ پر شب فراق میں آسمان سے بلائیں نازل ہو رہی ہیں اور دیدۂ اختر اس کے تماشائی ہیں اس لیے تاروں نے اپنا منہ آسمان کی طرف کر لیا ہے۔ اگر تاروں کی روشنی ہوتی اور ان بلاؤں کو آسمان سے اترتے دیکھ سکتا تو شاید اپنی حفاظت کی تدبیر کر سکتا۔ مگر نزول بلا سے بچنے کی تدبیر اندھیرا گھپ ہونے کے سبب سے سمجھ میں نہیں آتی۔

حسرت موہانی: کیوں اندھیری ہے شب غم، اس کا جواب یہ ہے کہ آج بلاؤں کا نزول ہے جن کے اترنے کا تماشا دیکھنے کی غرض سے ستاروں کا رخ زمیں سے آسمان کی طرف پھر گیا ہے۔

احمد حسن شوکت: میری شب فراق بہت اندھیری ہے۔ کیونکہ بلاؤں کا نزول ہے خواہ مخواہ ستاروں کی نگاہ اوپر ہی رہے گی۔ کیونکہ نجوم کے موافق بلاؤں کا نزول ستاروں کے اثر سے ہے اور جب ستاروں کی نگاہ کھلی رہے گی تو چاند چمکتا رہے گا مگر میرے حق میں بدستور مضر ہے۔ پس شب فراق کا تاریک رہنا فضول ہے۔

آسی لکھنوی: مولانا حسرت موہانی اور نظم طباطبائی دونوں حضرات نے ادھر لکھا ہے اور یہ معنی بیان کیے ہیں کہ تاریکی غم اس سبب سے ہے کہ بلندی دعرش سے بلائیں اتر رہی ہیں۔ ان کا تماشا دیکھنے کے لیے اس طرف سے اس طرف آنکھیں پھرتی ہیں۔ ادھر بمعنی آنجا صحیح نہیں۔ ادھر بمعنی اینجا صحیح ہے۔ مصنف اعتراضاً کہتا ہے کہ آج بلائیں نازل ہو رہی ہیں اور دیدۂ اختر نحوست بھی ادھر ہی کو کھلا رہے گا۔ کیوں از راہ اعتراض ہے نہ کہ بطریق سوال۔

غلام رسول مہر: میری غم بھری رات اتنی اندھیری کیوں ہے کہ اس میں ستاروں کے ٹمٹماتے دیے بھی نظر نہیں آتے۔ پھر خود ہی اس کا سبب یہ بیان کرتا ہے کہ عالم بالا سے روئے زمین پر بلائیں نازل ہو رہی ہیں اور ستارے دنیا کے آسمان کی طرف سے آنکھیں پھیر کر عالم بالا کو تک رہے ہیں جدھر سے بلائیں اترتی ہیں۔ ستاروں کی آنکھیں اس منظر سے ہٹ نہیں سکتیں۔ لہٰذا میری غم بھری رات سراسر اندھیری ہو گئی۔

آغا باقر: آج شب غم تاریک کیوں؟ اس لیے کہ آسمان سے زمین پر مصیبتیں نازل ہو رہی ہیں اور تاروں نے ان کے اترنے کا تماشا دیکھنے کے لیے اپنی آنکھیں آسمان کی طرف پھیری ہیں۔

جوش ملسیانی: شب غم اتنی تاریک کیوں ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ عرش سے اتنی بلائیں اتر رہی ہیں کہ ایک میلہ سا لگا ہوا ہے اور ستارے اس میلے کے تماشائی بن کر ادھر ہی کو دیکھ رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ روشنی میرے گھر کی طرف نہیں آتی۔

تمام شارحین گرامی نے کم و بیش یہی کہا ہے چونکہ آسمان سے بلائیں نازل ہو رہی ہیں اس لیے سارے ستاروں نے اپنی آنکھیں

ان بلاؤں کے نزول کا تماشا دیکھنے کے لیے اس طرف پھیر لی ہیں اور اسی شب غم اتنی اندھیری ہے۔ اس تشریح کے دوران شارحین نے ان بلاؤں کے نزول اور ستاروں کی آنکھوں کے اس طرف پھر جانے کے جواز میں وہ وہ کمال دکھائے ہیں کہ باید و شاید۔ مثلاً بیخود صاحب کہتے ہیں۔ ''اگر تاروں کی روشنی ہوتی اور میں ان بلاؤں کو آسمان سے اترتا دیکھ سکتا تو شاید اپنی حفاظت کی تدبیر کر سکتا۔ مگر اندھیرا گھپ ہونے کے سبب بچنے کی کوئی تدبیر سمجھ میں نہیں آتی۔ احمد حسن شوکت کہتے ہیں۔ '' کیونکہ نجوم کے موافق بلاؤں کا نزول ستاروں کے اثر سے ہے اور جب ستاروں کی نگاہ کھلی رہے گی تو چاند نہ رہے گا مگر میرے حق میں بدستور مضر ہے۔ پس شب فراق کا تاریک رہنا فضول ہے۔'' یعنی چہ! کیا کہنا چاہتے ہیں اور اس تشریح کا مطلب کیا ہوا۔ مندرجہ بالا تمام شارحین میں صرف آسی نے لفظ ''ادھر'' کی طرف تھوڑی توجہ دی ہے لیکن وہ بھی اس کو ادھر تصور کر کے ایک دوسری اندھی گلی میں چلے گئے ہیں جو غالب کی شب غم سے زیادہ تاریک ہے۔ غرض کسی شارح نے غالب کو ذہن میں رکھتے ہوئے شعر کی طرف توجہ نہیں دی۔ ہر ایک نے سامنے کے الفاظ سے معنی نکالنے کی کوشش کی ہے اور اس لیے غلطی پر غلطی کرتے چلے گئے ہیں۔

آپ اس شعر کو اگر یہ سوچ کر پڑھیں کہ یہ غالب کا شعر ہے جو اپنے انداز بیان کا منفرد شاعر ہے۔ اور اس انداز بیان میں رمزیت اشاریت ایجاز و تخیل اہم حیثیت رکھتے ہیں تو یقیناً ایک دو بار کی خواندگی ہی میں آپ اس کے اصل مفہوم تک پہنچ جائیں گے۔ لیکن بات یہ ہے کہ غالب چونکہ خود ایک بلند فکر شاعر ہے وہ اپنے قاری سے بھی تخیل کی ایک سطح کا متقاضی ہے اس لیے ہر وہ شخص کہ جو ذوق شعری کی وہ سطح نہیں رکھتا اس کے اشعار کے مفہوم تک نہیں پہنچ سکتا اور نتیجتاً ان سے لطف اندوز بھی نہیں ہو سکتا۔

غالب کو یہ شعر کہتے وقت معلوم تھا کہ شب غم اندھیری ہوتی ہے، روشن نہیں ہوتی۔ لیکن جب وہ اپنے آپ سے سوال کرتا ہے کہ شب غم آج اتنی اندھیری کیوں ہے اور یہی نہیں بلکہ اس پر مستزاد یہ ہے کہ آسمان سے مسلسل بلاؤں کا بھی نزول ہو رہا ہے تو ایسا کیوں ہے؟ یہی وہ مقام فکر یہ ہے کہ جو قاری اور شارح دونوں کو اس طرف متوجہ کرتا ہے۔ یہاں یہی دونوں سوال اس سانحہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور اس کا اتا پتہ بھی دیتے ہیں جس کی وجہ سے یہ سب کچھ ہو رہا ہے اور شاعر جس کی شکایت کر رہا ہے۔ دوسرا مصرع بھی اس واقعہ ہی کی تکمیل کر رہا ہے جس ضمن میں اس نے پہلے مصرع میں دو سوال کیے ہیں۔ یعنی یہ داستان غم تین حصوں میں بیان کرتا ہے۔

۱۔ آج شب غم اتنی اندھیری کیوں ہے

۲۔ آج (آسمان سے) بلاؤں کا نزول کیوں ہو رہا ہے

۳۔ (آج کیا) ستارے بھی ادھر ہی دیکھتے رہیں گے؟

اب اگر شارح یا قاری میں تھوڑا سا ذوق سلیم بھی ہے تو وہ فوراً شب غم کے تاریک تر ہو جانے، بلاؤں کے نزول کے سبب اور تمام اجرام فلکی کے اس طرف متوجہ ہو جانے کے سبب صرف ایک نتیجے پر پہنچے گا اور وہ یہ کہ آج شاعر کا محبوب رقیب کے پہلو میں ہے۔

بس یہی اس شعر کا مفہوم ہے۔"

مجھ سے کہا جو یار نے جاتے ہیں ہوش کس طرح
دیکھ کے میری بے خودی چلنے لگی ہوا کہ یوں

اتفاق ایسا ہے کہ یہ شعر بھی اس غزل کے مطلع کی طرح انتہائی سادہ اور عام فہم شعر ہے اور میرے حساب سے اس شعر کو بھی کسی صورت مشکلات غالب میں شامل نہیں ہونا چاہیے تھا۔ لیکن کیا کیا جائے ہمارے شارحین کرام نے مجبور کر دیا۔ اس سادہ سے شعر کی ایسی بے سروپا تشریح کی ہے کہ ان کی طرز فکر پر افسوس ہوتا ہے۔

غلام رسول مہر: جب محبوب نے مجھ سے پوچھا کہ ہوش کس طرح اڑتے ہیں تو مجھ پر بے خودی کا عالم طاری ہو گیا۔ یہ دیکھتے ہی ہوا چلنے لگی اور اس نے بتایا کہ ہوش یوں اڑتے ہیں۔ یعنی محبوب کا جلوہ دیکھ کر ہوش وحواس اس طرح رخصت ہو جاتے ہیں۔

سلیم چشتی: یار نے مجھ سے پوچھا کہ ہوش کس طرح جاتے رہتے ہیں۔ میں چونکہ ہمیشہ عالم بے خودی میں رہتا ہوں اس لیے جواب نہ دے سکا۔ میری بیخودی دیکھ کر ہوا نے میری مدد کی۔ یعنی فوراً چلنے لگی گویا اس نے زبان حال سے بتا دیا کہ ہوش اس طرح اڑ جاتے ہیں۔

آسی: مجھ سے جو یار نے کہا کہ ہوش کس طرح اڑ جاتے ہیں تو میری بے خودی دیکھ کر ہوا چلنے لگی کہ ہوش اس طرح اڑ جاتے ہیں۔ نکتہ یہ ہے کہ میری ہر شے دشمن ہے۔ اس کے سوال کا جواب دینے کی مجھے نوبت ہی نہ آئی۔ ہوا نے پہلے سے جواب دے دیا۔ یا یہ کہ ہر ایک شے میرے درد دل سے واقف ہے اور ہر شے میری حالت پر گواہ ہے یا یہ کہ ہر چیز اس کی مطیع ہے اور اس کے سوال کے جواب کے لیے تیار ہے۔

میں نے چند نمائندہ شارحین کے اقوال نقل کیے۔ دوسرے شارحین کو میں خوف طوالت سے نظر انداز کرتا ہوں اور نظر انداز اس لیے کرتا ہوں کہ کوئی بھلا مانس ٹھہر کر یہ نہیں سوچتا کہ ہوش کا ہوا سے کیا تعلق ہے اور ہوا نے بھلا چل کر یہ کیوں بتایا کہ ہوش اس طرح جاتے رہتے ہیں۔

اب آیئے شعر کے دوسرے مصرعے کی طرف۔ "دیکھ کے میری بیخودی"

یہاں لفظ بیخودی پہلا کلیدی لفظ ہے جو شعر کے مطالب کی طرف لے جاتا ہے اور اس کے معنی ہیں۔ نشے کی کیفیت، مستی۔ یہ وہ کیفیت ہے جو بیہوشی سے سراسر مختلف ہوتی ہے۔ اب دنیائے میخواری کی یہ ایک پیش پا افتادہ حقیقت ہے کہ جب آدمی نشے میں ہو اور اس کو ہوا لگ جائے تو فوراً بے ہوش ہو جاتا ہے۔ چنانچہ شعر کا مفہوم ہی یہ ہے کہ جب یار نے مجھ سے پوچھا کہ انسان بیہوش کس طرح ہوتا ہے تو ہوا نے فوراً چل کر اسے دکھا دیا کہ دیکھو اس طرح ہوتا ہے۔ یعنی میں تو پہلے سے مست تھا ہی ہوا نے مجھے بیہوش بھی کر دیا۔"

صرف ان تین اشعار کی تشریح سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ جناب پرتو روہیلہ کی یہ بے مثال کاوش کس پائے کی ہے اور اس کا معیار کیا ہے۔ شعری مجموعوں میں جو مقام و مرتبہ دیوان غالب کا ہے کلام غالب کی تشریح و توضیح میں وہی مقام و مرتبہ پرتو روہیلہ کی کتاب "مشکلات غالب" کا ہے۔

☆☆☆

جواز جعفری

ایک انقلابی جدوجہد کا رزمیہ

سویت یونین کے عظیم انقلابی قائد اور سیاسی مدبر لینن نے اپنی مشہور کتاب ''اسٹیٹ اینڈ ریولیوشن'' میں لکھا ہے کہ جب کسی سوسائٹی میں انقلاب کے خدوخال واضح ہونا شروع ہوتے ہیں تو انقلاب دشمن قوتیں بھی فوراً حرکت میں آجاتی ہیں اور انقلاب کو ناکام بنانے کے لیے ترغیبات سے لے کر تصادمات تک ہر حربہ استعمال کیا جاتا ہے۔ ان تمام رکاوٹوں کے باوجود اگر انقلاب کامیاب ہو جائے تو ایسے میں انقلاب دشمن بھی بدلے ہوئے حالات کے مطابق اپنا طریقہ واردات بدل لیتے ہیں اور آئندہ انقلاب کی مخالفت کرنے کی بجائے انقلابی پارٹی کی ممبر شپ حاصل کر کے انقلابیوں سے بھی زیادہ انقلابی نظر آنے لگتے ہیں۔ اب ان لوگوں کی اصل منزل قوت ناخذہ تک رسائی ہوتی ہے اور جب وہ انقلاب کے اعلیٰ ترین اداروں پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو اپنی دیرینہ اور انقلاب دشمن آرزوؤں کو انقلاب کے نام پر پیش کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ ایسے میں انقلاب کے سچے اور اصلی کارکنوں کی طرف سے ردعمل بھی ایک فطری امر ہوتا ہے جسے منتشر کرنے کے لیے ترغیب، دھوکہ دہی، تشدد اور جلاوطنی جیسے حربے کامیابی سے استعمال میں لاتے جاتے ہیں اور یوں ایک کامیاب انقلاجب کو ایک منصوبہ بندی کے ذریعے ضائع کر دیا جاتا ہے۔

ردانقلاب کی قوتوں کی طرف سے یہ حربہ دنیا کے تقریباً کامیاب انقلاب کے خلاف آزمایا گیا حتی کہ فتح مکہ کے بعد اسلام کے اندر بھی اس کہانی کو اسی طرح دہرایا گیا۔ تاریخ گواہ ہے کہ بانی اسلام کی رحلت کے محض دو دہائیاں بعد فتح مکہ کے دن کلمہ پڑھنے والے عالم اسلام کے سیاہ وسفید کے مالک بن چکے تھے اور جن لوگوں نے سے ہمیشہ کے لیے خاموش کر دیا گیا۔ ''میری زندگی'' میں ٹراٹسکی کی بجائے ان بے شمار لوگوں کی کہانی بھی ہے جو انقلاب روس کے ممتاز ترین کارکنوں میں شمار ہوتے تھے مگر لینن کی موت کے بعد انقلاب کو یرغمال بنا لینے والی ردانقلاب کی قوتوں نے اپنی آرزوؤں کی راہ میں حائل ہونے والے انقلاب کے ان معماروں کو قید، جلاوطنی اور جسمانی موت کے ذریعے منظر سے ہٹا دیا۔ کیا یہ مقام حیرت وعبرت نہیں کہ ۱۹۳۱ء تک انقلاب برپا کرنے والی پارٹی کی مرکزی کمیٹی کے ۱۲۹ اراکین میں سے صرف ایک رکن اقتدار میں رہ گیا تھا اور وہ خود سٹالن تھا؟

سٹالن اور اس کی رجیم نے اشتراکی انقلاب کے تحفظ اور انقلابیوں کے بھیس میں اقتدار پر قابض بہروپیوں کا پردہ خاک کرنے کے جرم میں ٹراٹسکی کو خصوصی طور پر ریاستی جبر وتشدد کا نشانہ بنایا۔ اسے انقلابی ہیرو سے زیرو بنانے کے لیے پورا ریاستی میڈیا جتا ہوا تھا۔

مقتدر پارٹی سے لے کر مغربی سامراجیت تک اور مذہبی پیشوائیت سے لے کر زار شاہی کی باقیات تک سب اس کے خلاف اٹھ کھڑا ہوتے تھے۔ یہ ایک ایسی لڑائی تھی جسے آپ واقعی جو کبھی ایک غیر مشروط انقلابی ہی لڑ سکتا ہے۔ اس لڑائی میں اس نے کبھی ہتھیار پھینکنے کے بارے میں نہیں سوچا حتی کہ ۲۰ اگست ۱۹۴۰ء میں اسے میکسیکو کے محاذ پر قتل کر دیا گیا۔

مارکس، لینن اور ٹراٹسکی کے نظریات سے انحراف، اقتدار پرستوں کو بالآخر ان رستوں کی طرف لے گیا جن پر چلنے کا لازمی نتیجہ ریاستی زوال اور انہدام تھا۔ مارکس اور لینن کے افکار کے مطابق ریاست کو تو بہر حال ایک روز ختم ہونا ہی تھا کہ کسی معاشرے میں ریاستی ادارے کا ظہور دراصل اس بات کا ثبوت بھی ہے کہ وہاں نہ صرف طبقات موجود ہیں بلکہ ایک طاقتور طبقہ معاشرے کے مادی وسائل اور اقتدار پر اجارہ داری قائم کر چکا ہے اور اپنی اجارہ داری کے تسلسل کے لیے ریاستی اداروں، فوج، پولیس، پارلیمنٹ وغیرہ عدلیہ کو اپنے حفاظت کے لیے استعمال بھی کر رہا ہے۔ گویا ریاست، طبقاتی سوسائٹی کا تنظیمی اظہار ہے۔ ایسے معاشرے میں جب سوشلزم آتا ہے تو وہ ہر قسم کی اجارہ داریوں کو ختم کر کے ایک Class less سوسائٹی قائم کرتا ہے۔ جب کوئی سوسائٹی مکمل طور پر کلاس لیس ہو جاتی ہے تو ریاست بھی خود بخود تحلیل ہو جاتی ہے کیونکہ جب ریاست کے ذریعے مفادات حاصل کرنے والا طبقہ ہی نہیں رہے گا تو ریاست اپنا وجود کیسے برقرار رکھ سکے گی؟ گویا ریاست کی تحلیل ایک کامیاب سوشلسٹ سوسائٹی کی تشکیل کا الٹی میٹ نتیجہ ہوتا ہے مگر سویت ریاست جس طرح تحلیل ہوئی یہ مارکسٹ نظریے سے بغاوت کا منطقی انجام تھا۔ سلیم کوثر کا ایک شعر ہے۔

کبھی لوٹ آئیں تو پوچھنا نہیں دیکھنا انہیں غور سے

جنہیں راستے میں خبر ہوئی کہ یہ راستہ کوئی اور ہے

دنیا کی سیاسی تاریخ میں یہ کہانی بار بار دیکھنے میں آتی ہے کہ اقتدار پر قبضہ کرنے کے بعد زیرو ہیرو بن جاتے ہیں جبکہ جو اصلی ہیرو ہوتے ہیں انہیں ریاستی پراپیگنڈے کے زور پر زیرو بنا دیا جاتا ہے۔ سویت یونین میں یہ عمل ٹراٹسکی کے ساتھ بھی دہرایا گیا۔ اس پر الزامات لگائے گئے، کردار کشی کی گئی، رجعت پسندی اور انقلابی کھلے طعنے دیے گئے اور اس کا نام سویت یونین کی دستاویزات تک سے حذف کر دیا گیا مگر یہ اس کے نظریات کی استقامت تھی جس نے روس کے انہدام کے ساتھ ہی اسے ایک بار پھر ہیرو کے درجے پر فائز کر دیا۔ سچ تو یہ ہے کہ سویت یونین کے انہدام کے بعد مغربی میڈیا کی طرف سے کیے گئے یکطرفہ پراپیگنڈے میں وہ بائیں بازو کے بے یار و مددگار کارکنوں کے لیے اندھیر میں امید کی کرن بن کر سامنے آیا اور اس کی درست پیشگوئیوں، تاریخی تجزیوں اور غیر متزلزل سیاسی بصیرت نے زخمی دلوں پر مرہم کا کام کیا۔ سویت یونین کے انہدام کے بعد جس شخص کی تحریروں نے بکھرے ہوئے کارکنوں کو حوصلہ بخشا وہ ٹراٹسکی ہی ہے۔ اس کی تحریریں سوشلسٹوں کو ایک نئی سمت میں راہنمائی فراہم کر رہی ہیں۔

ٹراٹسکی کی آپ بیتی ''میری زندگی'' کا شمار دنیا میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی آپ بیتیوں میں ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسے

سیاستدان کی آٹو بائیو گرافی ہے۔ جس کی طرف دنیا بھر کے اہل قلم نے ہمیشہ کشش محسوس کی۔ یہ کتاب ہمیں بتاتی ہے کہ انقلاب اور انقلاب کیا ہے؟ آپ اسے ٹراٹسکی کی بجائے ایک زندہ انقلاب کی آپ بیتی بھی کہہ سکتے ہیں۔ ٹراٹسکی تو محض اس کا راوی ہے۔ یہ آپ بیتی انقلاب روس، انقلابی جدوجہد اور انسانی سماج کے ارتقاء سے جڑے ہوئے اہم ترین سوالوں سے معاملہ کرتی ہے۔ یہ دنیا کے حالات واقعات کا مناسب اور اعلیٰ ترین اظہار ہے۔ یہاں مباحثے، مناظرے، ہڑتالیں، مظاہرے، اختلاف واشتراکات، محبت و نفرت، رشک ورقابت، قربانی وخودغرضی، پارلیمانی جھڑپیں اور ان جھڑپوں کی اوٹ سے جھلکتے مفادات، سب کچھ ہے یوں یہ آپ بیتی نظریات، نظریاتی ارتقا اور نظریاتی جدوجہد کا رزمیہ بن جاتی ہے یہ ایک طرف تو ٹراٹسکی کی دیگر تحریروں کا تسلسل ہی ہے اور دوسری طرف اس بات کا اشاریہ بھی کہ قلم کو ہتھیار کیسے بنایا جاسکتا ہے؟

''میری زندگی'' کا اسلوب نہایت شاعرانہ ہے اور اس لحاظ سے بھی یہ کتاب خوش قسمت ہے کہ اسے اردو کا ملبوس پہنانے کے لیے جاوید شاہین جیسا شاندار شاعر نصیب ہوا۔ جس نے نہ صرف اس کے شاعرانہ اسلوب کو مزید طاقت وتوانائی بخشی بلکہ ٹراٹسکی کے نظریات کو مئیم بنائے بغیر نہایت روانی، سادگی اور وضاحت کے ساتھ ترجمہ کیا۔ ترجمہ کرتے ہوئے جاوید شاہین نے ادبی دیانت اور Pevotion کا بھی ثبوت دیا ہے۔ اس Pevotion کی ایک اہم وجہ خود ان کا بائیں بازو کی سیاست کے ساتھ گہری کمٹمنٹ کا اظہار ہے۔ میرے نزدیک وہ اردو زبان کے ان چند اچھے شاعروں میں سے ہیں جو بائیں بازو کی سیاست، اس کے تضادات اور نظریاتی ارتقاء کا اس قدر گہرا ادراک رکھتے ہیں۔ ''میری زندگی'' کے ترجمہ کا انتخاب ہی مارکسزم سے ان کی گہری وابستگی کا کھلا اظہار ہے۔

یہ ترجمہ جاوید شاہین کی ادبی زندگی کا اہم ترین رخ ہے۔ اکثر اہل قلم کو کہتے سنا گیا ہے کہ جب تخلیق کار کو بنجر رت گھیرے تو اسے تراجم کی طرف آنا چاہیے دیگر زبانوں کے تراجم اسے نئی طاقت وتوانائی بخشیں گے مگر اس سلسلے میں جاوید شاہین کا معاملہ ذرا مختلف ہے کہ ترجمہ ان کی تخلیقی زندگی ہی کا ایک طاقتور اظہار ہے۔ شاعروں میں کلیات کی اشاعت کا مرحلہ تخلیقی وفود کے تھمنے کی طرف اشارہ سمجھا جاتا ہے مگر جاوید شاہین کا تخلیقی دریا تو خشک ہونے کی بجائے کناروں تک بہہ رہا ہے۔ ''عشق تمام'' کے بعد حال ہی میں منظر عام پر آنے والا نیا مجموعہ ''دیر سے نکلنے والا دن'' میری بات کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

برنیڈرسل کا کہنا ہے کہ نئی بات کہنا صرف شاعر اور عاشق کے لیے ہی ممکن ہوتا ہے جبکہ میرے نزدیک ترجمہ تو ہر کوئی کر لیتا ہے مگر تخلیقی ترجمہ صرف شاعر ہی کر سکتا ہے۔ جس کی بہترین مثال جاوید شاہین کا یہ ترجمہ ہے۔ یہاں میں جدوجہد پبلشرز کے مہتمم اور ممتاز مارکس سکالر لال خان کو بھی مبارکباد پیش کروں گا جو طویل عرصے سے پاکستان میں سوشلزم کا علم اٹھائے ہوئے ہیں۔ ''میری زندگی'' اور سوشلسٹ لٹریچر سے متعلق بہت سی دوسری کتابوں کی اشاعت مارکسزم سے ان کی غیر مشروط وابستگی کا کامل ثبوت ہے۔

☆☆☆

حمید اختر

چودھری برکت علی اور ادب لطیف کے پچاس سال

لاہور ہمیشہ ہی سے علم و ادب کا گہوارہ رہا ہے۔ آج سے قریباً پچاس ساٹھ سال پہلے اسی مہذب شہر پہ غیر مسلموں کی اجارہ داری تھی۔ ہر ایک کاروبار پر وہی چھائے ہوئے تھے۔ رائے صاحب منشی گلاب سنگھ، عطر چند کپور، دو بڑے نام آج بھی ذہنوں سے محو نہیں ہوتے اور لاتعداد چھوٹے چھوٹے اشاعتی اداروں پر بھی غیر مسلموں کا عمل دخل تھا۔

گورنمنٹ کالج لاہور میں زمیندار گھرانے کا ایک سپوت، چودھری برکت علی نامی ذہین، ہونہار طالب علم، اپنا آبائی کام کھیتی باڑی چھوڑ کر حصول علم میں سرگرداں تھا۔ یہ وہ دور تھا کہ مسلمان خال خال ہی اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکتے تھے۔ چودھری برکت علی کے ساتھیوں میں ایک نام سید فدا حسین کا بھی تھا۔ علاوہ تعلیم کے کھیل میں بھی نمایاں۔ چودھری برکت علی اگر آئی ایس آئی کے امتحان میں شریک ہوتے تو کامیاب ہو جاتے۔ مگر انہوں نے روز اول ہی سے اپنے لیے تجارت اور وہ بھی نشر و اشاعت کو منتخب کیا تھا کہ اس زمانے میں اس کاروبار پہ کاملاً غیر مسلموں کا اجارہ داری تھی۔

۱۹۲۹ء میں گھر سے کچھ رقم حاصل کی اور بھاٹی دروازہ کے باہر ڈاکٹر طفیل حسین بخاری کے مطب کے ساتھ والی بڑی دکان کرایہ پر حاصل کر کے پنجاب بک ڈپو درسی کتابوں کی اشاعت کا ادارہ قائم کیا۔

چودھری برکت علی لگن کے پکے جستجو کے سچے ارادے کے دھنی تھے۔ سخت محنت کوشش کی اور خاصی درسی کتابیں چھاپ کر مارکیٹ میں لے آئے۔ ان کے مقابل غیر مسلمان پہلے ہی کاروبار پر چھائے ہوئے تھے۔ لہٰذا مقابلہ سخت ہوا اور یہ نڈر اور بے باک مسلمان چودھری برکت علی کامیاب ہوا۔

خواجہ دل محمد، چودھری محمد طفیل، سید ناظر حسین قدوسی، مرحومین اور لاتعداد مسلم اساتذہ کی درسی کتابیں میسر آئیں اور انہیں نہایت ذوق و شوق سے چھاپا۔ علاوہ نام کے مال بھی کمایا۔ چودھری برکت علی صاحب نے اپنا سکہ جمالیا۔ کام میں وسعت ہوئی۔ مددگاروں کی ضرورت محسوس ہوئی۔ گاؤں جا کر بڑے بھائی کے بڑے بیٹے چودھری نذیر احمد کو لے آئے۔ پنجاب بک ڈپو خوب پھلا پھولا۔ سینکڑوں کی تعداد میں درسی کتابیں چھاپ کر طلباء کی ضرورتوں کو پورا کیا۔ مستحق طلباء کی امداد بھی کبھی خست نہیں کی۔

کاروبار کو نہایت احسن طریقے سے چلایا۔ درسی کتب کے ساتھ ساتھ ادبی کتابوں کی طرف بھی توجہ دی۔ ایک الگ ادارہ مکتبہ

اردو قائم کیا اور اس دور کے ہر بڑے نام کی کتابوں کی قطار لگا دی۔ عصمت چغتائی، منٹو کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، ممتاز مفتی، بلوغت سنگھ اور نہ معلوم کن کن ادیبوں کو گوشہ تنہائی سے نکالا اور ادبی حلقوں سے متعارف کرایا۔

اپنے برادر نسبتی چودھری عبدالکریم کو نظم و نسق کا انچارج بنایا۔ اپنی انتھک کوششیں چودھری نذیر احمد کی جواں ہستی پر چار چاند لگا دیئے۔ پھر خیال آیا کہ ایک ادبی مجلہ بھی ہونا چاہیے۔ چنانچہ ادب لطیف ماہنامہ ۱۹۳۵ء میں شائع کیا۔ اس دور میں اور بھی پرچے نکل رہے تھے۔ نیرنگ خیال ان سب میں سرفہرست تھا کہ اس پرچے کو بھی ایک کہنہ ادیب حکیم محمد یوسف حسن نکال رہے تھے۔

''ادب لطیف'' روز اول ہی سے جدید ادب کا نقیب اور نئے لکھنے والوں کا رفیق کہلایا۔ کل کے بڑے نام بھی قلمی معاونین تھے اور اردو ادب میں بلند ترین نام ادب لطیف کی ادارت سے وابستہ اور منسلک رہے۔ ان میں فیض احمد فیض، میرزا ادیب، فکر تونسوی، عارف عبدالمتین، انتظار حسین، کشور ناہید، حمید اختر اور بے شمار ادیب، شاعر، صحافی ادب لطیف کی ادارت کرتے رہے۔

مکتبہ اردو ہی نے مکتبہ جدید ادب لطیف نے سویرا کو جنم دیا۔ چودھری نذیر احمد اپنے الگ ادارہ کے مالک بنے اور اپنا کاروبار شروع کیا۔

چودھری برکت علی، ایک سماجی کارکن بھی تھے اور سیاست سے دلی لگاؤ تھا۔ مجلس احرار اسلام کے سرگرم رکن تھے۔

کاروبار پھیلا۔ پنجاب بک ڈپو کی کوکھ سے مکتبہ اردو نے جنم لیا اور مکتبہ اردو نے مکتبہ جدید کو جنم دیا۔

ادبی کتابوں کا ایک سیلاب آ گیا۔ اگر ایک ادیب کی کتاب آج مکتبہ اردو نے چھاپی تو کل دوسرے کی نئی کتاب مکتبہ جدید نے چھاپ کر بازار میں پیش کر دی۔ طباعت کا ایک معیار بھی قائم کیا۔ ان اداروں کی شائع کردہ کتب اور رسائل آج بھی اپنی آن بان شان میں منفرد ہیں۔

چودھری برکت علی حلقہ احباب میں بے حد مقبول تھے۔ قیام پاکستان پر سب سے بڑی خدمت انہوں نے یہ کی کہ ایک ادارہ پبلشرز یونائیٹڈ نامی قائم کیا۔ اس کے دو حصے تھے۔ ایک حصہ اردو کتب شائع کرتا اور دوسرا حصہ انگریزی کتابیں برآمد کر کے فروخت کرتا۔ شیخ عبدالسلام مشہور پبلشر اردو حصہ کے انچارج اور انگریزی حصہ کے انچارج شیخ محمد امین ہوتے۔

پبلشرز یونائیٹڈ میں شامل بڑے بڑے نام تھے۔ سید حمید علی، دارالاشاعت پنجاب، ملک نور الٰہی، احسان اخبار کے مالک، شیخ محمد ہمایوں، قومی کتب خانے والے، شیخ نیاز احمد، شیخ غلام علی اینڈ سنز، ملک محمد عارف، حاجی دین محمد اینڈ سنز، شیخ محمد اشرف ....

غرضیکہ یہ انوکھا تجربہ خوب کامیاب رہا۔ ہر ایک خود بھی پبلشر تھا۔ مگر ان سب کو چودھری برکت علی نے ایک لڑی میں پرو دیا تھا۔ پبلشرز یونائیٹڈ ادارہ اگر اسی جذبے سے کام جاری رکھتا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ آج پاکستان بھر کا عظیم اشاعتی ادارہ ہوتا۔

اپنے دو اور بھتیجوں کو علمی ادبی کتابوں کی نشر و اشاعت کی طرف راغب کیا۔ چودھری بشیر احمد جو ان کے بڑے داماد بھی ہیں، اردو

ادب کی اشاعت میں ایک بلند مقام کے حامل ہیں اور ان کے چھوٹے بھائی چودھری بشیر احمد علاوہ پبلشر کے ایک جدید طباعت کے مرکز کے مالک بھی ہیں۔

محمد حنیف رامے، چودھری برکت علی کے بھتیجے ہیں۔ انہوں نے جہاں ادب، مصوری، صحافت ورثے میں پائی ہے وہاں چچا مرحوم کے مزاج کے عین مطابق سیاست میں بھی مقام حاصل کیا ہے اور پاکستان کے سب سے بڑے صوبے کے چیف منسٹر رہے ہیں۔

چودھری برکت علی ایک بے قرار روح لے کر آئے تھے۔ علاوہ درسی اور ادبی کتب کے انہوں نے فلاحی کاموں میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ قیام پاکستان کے یکے بعد دیگرے کئی مدارس قائم کیے۔ ہائی سکول اور جونیئر ماڈل سکول اپنے پیچھے یادگار کے طور پر چھوڑے۔

چودھری برکت علی کے بڑے صاحبزادے چودھری افتخار علی اپنے باپ کی طرح ایک اعلیٰ ذوق کے ساتھ ساتھ خاندانی شرافت اور نجابت کے بھی علمبردار ہیں۔ ان کے چھوٹے بھائی بھی اپنے والد کے اپنائے ہوئے پیشہ پبلشنگ سے وابستہ ہیں۔

چودھری صاحب کی دوسری صاحبزادی محترمہ صدیقہ بیگم ایک اعلیٰ ذوق کی حامل ادیبہ ہیں۔ آج کل وہ ادب لطیف کی ادارت سنبھالے ہوئے ہیں۔ اپنے باپ کی عظیم روایات کو ہر لحہ زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ ان کے عزائم بلند ہیں مگر موجودہ حالات سخت کٹھن ہیں۔ اب انہوں نے ایک اور پرچہ "تخلیق" کی ذمہ داری بھی سنبھال لی ہے۔

مکتبہ اردو کو ایک بار پھر ایک فعال پبلشنگ ادارہ بنانے کی تگ ودو میں ہیں۔ یہ باہمت خاتون ضرور کامیاب ہوں گی۔ ان شاء اللہ چودھری برکت علی مرحوم کے قائم کردہ ادارے پنجاب بک ڈپو، مکتبہ اردو اور رسالہ "ادب لطیف" نئے ولولے، جذبے اور لگن کے ساتھ ایک بار پھر جلوہ گر ہو کر رہیں گے۔ حال ہی میں محترمہ صدیقہ بیگم نے ادب لطیف کی پچاسویں سالگرہ کی تقریب منعقد کر کے ادب لطیف کے مداحوں کو چونکا دیا کہ فی زمانہ ادب لطیف کا دور نہیں، ڈائجسٹوں کا دور ہے۔ جدید اردو کے نقیب اور معمار اب اپنی عمریں ڈھال دینے کے باعث کچھ تھک سے گئے ہیں۔ پرانی روایات کو دوبارہ زندہ کرنا جان جوکھوں کا کام ہے۔

چودھری برکت کے تیسرے بیٹے محمد خالد چودھری اپنے ذاتی اشاعتی ادارے چودھری اکیڈمی لاہور اور پرانے ادارہ پنجاب بک ڈپو کی ذمہ داریاں سنبھالے ہوئے ہیں۔ ان کے جواں سال بیٹے چودھری محمد طارق بھی اپنے والد کے ساتھ اپنے آبائی کام میں مصروف ہیں اور معیاری ادبی کتب کی اشاعت کا گہرا شعور رکھتے ہیں۔

چودھری برکت علی کے وارثین پھر سے کمر باندھ کر میدان کشمکش میں اتر آئے ہیں کہ یہ دور جدیدت سے بھی آگے بڑھ کر خلاؤں کا دور ہے اور وقت جو پہلے تھم تھم کر بیتا تھا، اب آنکھ جھپکتے ہی صدیوں کا فاصلہ آن واحد میں طے کر لیتا ہے۔

☆☆☆

ڈاکٹر خیال امروہوی

برق پارے

دیر میں وحدانیت کی لو ملی جلوہ فگن
گھر گھر وحدت پرستوں کے صنم خانے لگے
سابقہ ہے جن درندوں سے زمانے میں خیال
بھیڑیا واقف ہو گر اس سے تو گھبرانے لگے

دل جلوں سے مست ہو یا مرد فرزانہ ملے
کچھ نہ کچھ بے باک ہو محفل میں مردانہ ملے
آج یوں ملنے لگا ہے آدمی سے آدمی
راہ میں جس طرح دیوانے سے دیوانہ ملے

وہ خیال انقلابی جو شرار بن رہا ہے
یہ خیال اک جنوں تھا جو نہاں تھا میرے سر میں
میں طلسم روز و شب سے نہ ہوا کبھی مسخر
مری صبح رات سے ہے مری رات ہے سحر میں

زندگی یوں بھی کبھی محسوس ہوتی ہے مجھے
جیسے انگارہ دھرا ہو ہاتھ پر جلتا ہوا
وجہ خوش فہمی نہیں ہے اپنی مہنگائی مگر
میں تری مانند کب بازار میں سستا ہوا

ناگن کی طرح ڈستی ہے راتوں کی سیاہی
دن میں غم ماحول کی تلوار چلے ہے
ہر جنس مری ذات سے رہتی ہے گریزاں
سائے میں جو بیٹھوں بھی تو دیوار جلے ہے

تیری شائستہ لباسی سے میں عریاں ہو گیا
میری عریانی تجھے ملبوس پہناتی رہی
وقت کے ظالم طمانچے پے بہ پے پڑتے رہے
بے حمیت زندگی رخسار سہلاتی رہی

چھن جائے مجھ سے میری الوہیت ضمیر
ایسا سماں کبھی نہ دکھانا خدا مجھے
اے طبع خود پسند بصد حزم و احتیاط
اک روز میری ذات سے کھل کر ملا مجھے

خلا پہ میرا تصرف نہ بحر و بر میرے
یہ کس مرض کی دوا ہیں نہیں اگر میرے
مرا وقار ہنر بے اساس و بے تمکیں
عظیم گرچہ ہیں آفاق میں ہنر میرے

جب بھی ماضی کی ہوا کا شبنمی جھونکا لگا
یوں ہوا محسوس جیسے دوزخی شعلہ لگا
اپنی شوریدہ سری میں، میں تجھے کیا ڈھونڈتا
مجھ کو اپنی جستجو کرتے ہوئے عرصہ لگا

مرے افکار میرا مرثیہ ہیں
میں ہوں ایسی ہی تنقیدوں کا خوگر
نہ ہی جمہوریت کا کاسہ بردار
نہ شاہان زمانہ کا گداگر

خاور اعجاز

قطعات

استقبال

اے آسماں کے ستارو بکھیر دو کرنیں
کہ وہ شہید سر رہگذر آتے ہیں
جو زندگی کے چراغوں میں خون ٹپکا کر
وطن کی مانگ ستاروں سے جگمگاتے ہیں

خبر

ایسی ہلچل مچی سحر کے وقت
جیسے اک کائنات جاگ گئی
بات نکلی کہ منہ اندھیرے آج
رات سورج کے ساتھ بھاگ گئی

خوف

میں دیار سخن کا سنیاسی
سوچ کا زہر جذب کرتا ہوں
لفظ منکے گلے میں ہیں پھر بھی
سانپ کے تبصرے سے ڈرتا ہوں

اگر

پتھروں سے گہر نکل آئے
محنتوں کا ثمر نکل آئے
لفظ کانیں تراشنے میں کہیں
ایک ہیرا اگر نکل آئے

امانت

خواہشوں کی کتاب واپس لے
عمر بھر کے عذاب واپس لے
بجھنے والی ہے چشم حسرت اب
زندگی! اپنے خواب واپس لے

کون جانے

کتنے ساغر چھلک چکے ہیں مگر
پھر بھی خالی پڑے ہیں پیمانے
کون جانے کتاب ہستی میں
نامکمل ہیں کتنے افسانے

المیہ

ہاتھ سے دور جا پڑی تلوار
کھل گئے سب پہ گری کے فنون
غیر نے جنگ جیت لی اور پھر
باندھتے رہ گئے نئے مضمون

پھر دیکھو

چکھو حرف معانی میں اور پھر دیکھو
آؤ میری کہانی میں اور پھر دیکھو
دیکھ رہے ہو کیا ساحل کی مٹی سے
تم بھی اترو پانی میں اور پھر دیکھو

سید صفدر حسین جعفری

حصار ذات

دیکھتا ہوں میں تری بجھتی ہوئی آنکھیں لرزتے ہاتھ بے قابو بدن
سوچتا ہوں پھول پتے تتلیاں چادر پہ اب کاڑھے گا کون
کون اڑھائے گا مجھے پروا کی راتوں میں یہ چادر
کون لے گا اب مجھے اپنے حصار ذات میں

●

اعجاز رضوی

زندگی

ہماری زندگی بھی طاق میں رکھی ہوئی گڑیا کی صورت میں
جسے ہم دیکھ سکتے ہیں
مگر چھونا ہمارے بس سے باہر ہے
ہماری سانس کی دوڑی
نظر کی تیز رو گھوڑی کو باندھے ہے
مگر دل کی صدا پہ ہنہناتی تیز رو گھوڑی
کہاں قابو میں آتی ہے
بہت روکیں اسے، پھر بھی یہ سرپٹ دوڑی جاتی ہے
کہاں قابو میں آتی ہے

●

سرفراز تبسم، گوجرانوالہ

مجھے تم سے محبت ہے!

سمجھ لو اب تمھیں میں مل نہیں سکتا
بچھڑنا، بھولنا
لازم ہے میری جاں
بہت مجبور ہوں، رنجور ہوں
کہ دور ہوں تم سے
مگر دھڑکن
تیری ہر سانس کی
آہٹ سناتی ہے
تجھے میں بھولنا چاہوں
مگر یہ کیسے ممکن ہے
مجھے بتلاؤ میری جاں
بھلا یہ کیسے ممکن ہے
تو میرے دل، میری ہر سانس
میرے جذبوں کی ساتھی ہے
تجھے جب دیکھنا چاہوں
میں بھر لوں اوک میں پانی
تیرے دیدار کی خاطر
مگر یہ طے ہے میری جاں
تجھے اب مل نہیں سکتا
بچھڑنا، بھولنا
لازم ہے میری جاں
بہت مجبور ہوں، رنجور ہوں
کہ دور ہوں تم سے
مگر یہ سچ کہوں تم سے
مجھے تم سے محبت ہے
مجھے تم سے محبت ہے

●

عمران ہاشمی، گوجرانوالہ

حرامام حریت

تہہ بہ تہہ
گرد میں ڈوبی ہوئی
اک شاخ وفا
وقت کے جبر تلے کچلی ہوئی
بے کس و بے بس و واماندہ، تہی
آتش عشق کی گرمائی ہوئی
عرق خوناب سے پاتی ہے نمو
اشک بیتاب سے کرتی ہے وضو
بر سر دشت بلا
توڑ کر جبر کا ہر دست قضا
دشت کو جلوہ گزار دکھا دیتی ہے
اپنے ہونے کا پتہ دیتی ہے

●

آمنہ مفتی

پہلی اینٹ

پسینے کی لکیر جب اس کی گدی سے بہہ کر کمر کے خم میں ٹپکنے لگی تو اس نے رندہ ہاتھ سے رکھ کر ادھ گھڑی گلی کو پرے ہٹا کر ایک لمبا سانس لیا۔ ہوا میں لکڑی کی چھیلن اور روغن کی باس تھی۔ دو ایک ہی ادھ بنی پیڑھیاں دیوار کے قریب رکھی تھیں اور کونے میں رکھے مٹکے کے پیندے پر پڑ آئی ہوئی کائی بھورا رنگ اختیار کر چکی تھی۔ فضا ساکن تھی اور دور کہیں ڈیزل انجن سے چلنے والے ٹیوب ویل کی دھک دھک سنائی دے رہی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر انگڑائی لی اور پسینے سے بھیگی ہوئی بنیان کو چٹکی سے پکڑ کر پھونک ماری مگر پسینے ماری منگجی بنیان لجلجی جھلی کی طرح اس کے سینے سے لپٹی رہی۔ کونے میں چنگیری سے ڈھکی روٹی تھی اور ڈیلوں کا اچار مگر اتنی شدید گرمی میں کچھ کھانے کو جی نہ چاہ رہا تھا۔

دکان کے باہر قصبے کی دھول میں اٹی کچی سڑک پر ایک گدھا گاڑی کھڑی تھی۔ گدھے کی دم میں ناسور تھا۔ جس پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں اور غالباً وہ ان مکھیوں کا اتنا عادی تھا کہ اطمینان سے کھڑا تربوز کے چھلکوں پر منہ مار رہا تھا۔ ریڑھی بان بڑی فرصت سے بیٹھا اپنی میلی میلی سوکھی پنڈلیاں کھجلا رہا تھا اور دھوتی کا پلو بے فکری سے الٹا ہوا تھا۔ اس کے آگے کیکر کا درخت تھا جس سے اکثر آندھی میں موٹی موٹی شاخیں چٹاخ چٹاخ ٹوٹ کر گرتی تھیں اور وہ یعنی عمدو ترکھان بڑی چالاکی سے انہیں اپنی دکان میں منتقل کر کے ان سے بڑے سبک گلی ڈنڈے گھڑ لیتا تھا۔ یہ گلی ڈنڈے قصبے بھر میں مشہور تھے۔ کہا جاتا تھا کہ عمدہ ترکھان کی گلی کو ٹل لگاؤ تو ایک محلے سے اڑ کر دوسرے محلے میں جا گرتی ہے۔ دکان کی اصل آمدن ان ہی گلی ڈنڈوں کی مرہون منت تھی ورنہ پیڑھیاں پلنگ اس عسرت زدہ قصبے میں کون روز خریدتا اور بنواتا تھا۔

اور ابھی پچھلے سال تو کمال ہی ہو گیا۔ ایک بڑا سوٹڈ بوٹڈ بابو نما شخص اسے ڈھونڈتا ہوا آیا اور اس سے ایک بلا گھڑنے کی فرمائش کی۔ وہ بڑا حیران ہوا۔ آج کے دور میں جب سیالکوٹ میں بہترین بلے تیار ہو رہے ہیں تو کون پاگل بھلا عمدو ترکھان سے بلا گھڑوائے گا مگر خیر اسے کیا؟

اس نے بڑی محنت سے دل لگا کر بلا گھڑا اور حسب فرمائش بغیر ریگ مال لگائے یوں ہی خام حالت میں خریدار کے حوالے کیا۔ خریدار بھی کیا دریا دل تھا۔ اس کام کی اجرت سے بغیر مانگے پانچ ہزار پکڑا دی۔ کتنی ہی دیر تو وہ ساکت کھڑا رہا تھا اور جب منہ کی لال

باچھوں سے بہہ کر اس کی ننھی سی عریاں توند پر گری تھی تو اس نے جلدی سے وال سڑک کر منہ بند کیا تھا اور کانپتے ہاتھوں سے نوٹ ڈب میں اڑس کر اپنی ایڑھی بیٹھی دیسی جوتی گھسیٹتا گھر دوڑا تھا۔ جہاں اس کی روگی بیوی پلنگ پر لیٹی بے آواز رو رہی تھی۔

پھر ایک لمبا سفر تھا۔ قصبے سے شہر تک اور شہر سے بڑے شہر تک بے تاثر چہروں والے ڈاکٹروں کی کھسر پھسر اور بے تعلق نرسوں کے مبہم سے جوابات اور جب پانچ ہزار روپوؤں میں سے آخری پیسہ بھی خرچ ہو گیا تو وہ صرف یہ جواب اپنی پوٹلی میں باندھ کر واپس لا سکے کہ حاجرہ کو کینسر ہے اور یہ کہ کینسر کی علاج گاہ جلد ہی شہر میں تعمیر ہو جائے گی (جب تک کینسر کے مریضوں کو چاہیئے کہ وہ مرنے سے احتراز کریں اور اگر موت آ بھی جائے تو یہ سوچ کر اطمینان سے مریں کہ ان کی اگلی نسلیں بغیر علاج کے نہیں مریں گی)۔

قصبے واپس آنے کے چھٹے روز حاجرہ مر گئی۔ آبادی کا واحد کمپاؤنڈر مستقل اپنی گنجی چندیا ہلا ہلا کر کہتے جا رہا تھا۔

"عمدو یہ تو نے کیا کیا؟ کینسر کو چھیڑنا نہیں چاہیئے۔ مگر تو پانچ ہزار بچا نہیں سکا۔ حاجرہ اتنی جلدی نہ مرتی اگر تو اسے شہر لے کر نہ جاتا۔"

اور وہ کف افسوس ملتا رہ گیا۔ اب بھی وہ اس وقت کو کوستا تھا۔ جب وہ منحوس آدمی اس کی دکان میں داخل ہوا تھا اور اپنی مکروہ لنجی انگلیوں سے وہ کالے کوؤں جیسے اجاڑ نوٹ اسے پکڑا کر گیا تھا۔ کاش وہ وقت لوٹ آتا اور وہ مکڑی کے اس کندے کو گھڑنے کی بجائے کی بجائے کیکر کی مسک سبک گلیاں گھڑتا رہتا۔ گھڑتا رہتا۔ یہاں تک کہ ساری دکان گلیوں سے بھر جاتی ساری گلی، سارا قصبہ، ہر پاسے گلیاں ہی گلیاں ہو جاتیں اور وہ شہری آدمی گلیوں کے اس سیلاب میں بہہ جاتا، پچک جاتا اور حاجرہ کی جگہ اس کا لاشہ سفید کفن میں لپٹا رکھا ہوتا اور وہ خوشی خوشی اس کی پھوڑی بچھاتا، بین ڈالتا، اسے سجاتا سنوارتا اور دولہا بنا کر قبر کی پہنائیوں میں اتار آتا اور ایک بڑی سی گلی اس کے کتبے کی جگہ گاڑ آتا جس لکھا ہوتا۔

"یہاں وہ آدمی دفن ہے جو شہر سے موت کے پیامبر روپے لے کر آیا اور عمدہ ترکھان کی گلیوں تلے دب کر مر گیا۔ رہے نام اللہ کا"

مگر وہ خیالوں میں پڑا جھینکتا رہتا۔ یہ ایک حقیقت تھی کہ حاجرہ مر چکی تھی۔ جوان خوبصورت، کیری حاجرہ اور وہ اجڑی ہوئی دکان پر بیٹھا میلی بنیان سے بہتے پسینے سے تر سینے پر پھونکیں مار رہا تھا۔ گلی میں ایک اور بدنصیب اپنی سڑتی ہوئی دم کے تعفن سے بے نیاز تربوز کے چھلکے کھا رہا تھا اور ساتھ کی دکان میں ٹی وی چل رہا تھا۔

جورائی سٹال والا پچھلے سال ہی ٹی وی اور ڈش انٹینا خرید لایا تھا۔ حاجرہ کے مرنے سے پہلے ہی (اب وہ ہر واقعے کو حاجرہ کے مرنے سے پہلے اور حاجرہ کے مرنے کے بعد کے کیلنڈر میں دیکھتا تھا)۔ مگر مارے مروت کے اس نے حاجرہ کے چہلم تک ٹی وی نہ لگایا۔ ٹی وی کا لگنا تھا کہ جورے کی دکان پر دنیا امڈ آئی۔ خبریں، پنچ فلمیں غرض ایک دنیا تھی جو اس ذرا سے ڈبے میں بند تھی۔ ٹی وی دیکھنے والے مروت کے مارے چائے کا کپ یا سگریٹ کی ڈبی بھی خرید لیا کرتے تھے۔ یوں جورے کی دکانداری خوب چمکنے لگی۔

کبھی کبھار جب اس کا دل بہت ہی گھبراتا تو وہ گھڑی دو گھڑی ٹی وی کے آگے بیٹھ آتا تھا۔ جورا ہمیشہ اس سے بڑے اخلاق سے

پیش آتا اور سگریٹ سے اس کی تواضع کرتا۔ اگر گاہک کم ہوتے تو دونوں مل کر ٹی وی دیکھتے اور پروگراموں پر تبصرے بھی کرتے جاتے۔ کسی ڈرامے میں کینسر سے سسکتا ہوا مریض دکھائی دے جاتا تو جورا فوراً اسٹیشن بدل کر ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگتا مگر عمدو دیر تک خاموش بیٹھا اپنے موٹی موٹی انگلیوں والے گھٹنے ہوئے ہاتھوں سے پیر کے انگوٹھے مسلتا رہتا اور بار بار ایسے منہ کھلتا جیسے کچھ کہنا چاہتا ہو اور پھر چپکا ہو رہتا۔

آج بھی اس پر اکتاہٹ اور بیزاری کا دورہ پڑا ہوا تھا۔ ادھ گھڑی گلی کو بے کیفی سے پرے اچھالتے ہوئے اس نے دونوں ہاتھوں کو اچھی طرح بنیان پر رگڑا۔ تہمند کھول کر ایک مرتبہ دوبارہ کسا اور کھنکار کے تھوک کا غلغلہ سڑک پر تھوک دیا۔ گدھا ذرا سا چونکا اور پھر اسی طرح کھڑا ہو گیا۔

جورے کی دکان ویران پڑی تھی اور وہ اکیلا بنچ پر بیٹھا سگریٹ پھونک رہا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ بڑے اخلاق سے مسکرایا اور ذرا سا کھسک کر گویا اسے بیٹھنے کی دعوت دی۔ دونوں بنا کچھ کہے ٹی وی دیکھنے لگے۔ اسے چپکا دیکھ کر جورے نے کوئی بلے گلے والا اسٹیشن لگانا چاہا مگر اسی لمحے سکرین پر وہی شہری آدمی عمدو ترکھان کا گھڑا ہوا بلا ہاتھ میں لیے اسٹیشن پر کھڑا نظر آیا۔ عمدو کی آنکھوں میں اشتیاق دیکھ کر جورے نے بھی اپنا ارادہ بدل دیا اور آواز ذرا سی بڑھا دی۔

"حاضرین یہ بلا میری فلم میں استعمال ہوا تھا۔ آپ جانتے ہی ہیں کہ میری فلم مقامی لوگوں کی باہمت جدوجہد کی کہانی تھی۔ آپ کی محبت تھی کہ اس فلم کو بہترین فلم کا ایوارڈ ملا اور اب میں چاہتا ہوں کہ آج اس شام آپ میں سے سب سے مخیّر اور انسان دوست شخص اس بلے کو خرید لے۔ یہ بلا ایک علامت ہے۔ محبت اور دکھی انسانیت سے ہمدردی کی۔ اس کی فروخت سے حاصل ہونے والا روپیہ کینسر ہسپتال کی تعمیر میں خرچ کیا جائے گا۔ جہاں غریبوں کا علاج مفت کیا جائے گا۔ تو صاحبان کون ہے جو اس ہسپتال کی تعمیر کی پہلی اینٹ مہیا کرے گا اور اس بلے کو خریدے گا۔"

جورا اور عمدو منہ کھولے ٹی وی کو تک رہے تھے۔ نیلامی چلتی رہی اور پھر ایک ابھرے ہوئے پیٹ والے سیٹھ نے ڈیڑھ کروڑ روپے میں وہ خام گھڑا ہوا بلا خرید لیا۔ خوب تالیاں پٹیں۔ جن کی گونج اس گرد بھری گلی میں پھیل گئی اور چھلکے ٹونگتے ہوئے گدھے نے اپنی زخمی دم ہلا کر بڑی ہمدردی اور انس سے پاؤں مسلتے عمدو ترکھان اور ٹی وی کی طرف دیکھا اور سر جھکا لیا۔

☆☆☆

تبصرہ نگار: شگفتہ نازلی

"پتھر کی میلی آنکھ"

محترم رب نواز مائل...... اپنے شعری مجموعے...... پتھر کی میلی آنکھ...... کا تعارف خود اشعاراتی پیرائے میں...... یوں کراتے ہیں کہ قاری پر بھی زندگی کا پس منظر و منظر نامہ واضح ہو جاتا ہے...... اور...... وہ آنے والے صفحات میں ان کے ذہنی رویوں ور جحانات کو اس مناظر میں دیکھتا...... اور...... سہل و سلیس انداز میں سمجھتا ہے۔

ہو نہ کوشش سے بھی جب یہ صاف کچھ
زندگی پتھر کی میلی آنکھ ہے!

ان کی غزلیات وقت کی بہی زو میں مختلف موضوعات کو اپنے میں سموتی چلی گئی ہیں اور زندگی کے تجربات نے جو کچھ انہیں لوٹایا اور مشاہدات کو جیسا پایا وہ مطالعے کے ساتھ ساتھ اشعار کے پیکر میں...... ڈھلتا گیا جبکہ اب مجموعے کی صورت میں اپنے جملہ رنگوں درد شعری کے ساتھ ادبی قارئین کے روبرو ہے...... جب وہ فانی زندگی کا تذکرہ اس انداز میں کرتے ہیں۔

متاع ہوش و زر تو چیز ہے کیا
کہ اپنی جان بھی جب اس کی ہی ہے

تو اسے پڑھتے ہوئے غالب کے مصرعے...... جان دی، دی ہوئی اسی کی ہے...... کی بازگشت محسوس ہوتی ہے...... دراصل شاعرانہ موضوعات میں بعض اوقات یکسانیت عمومی بات ہے صرف انداز بیاں اس عمومی موضوع کو...... خصوصی بنا دیتا ہے۔ اسی لیے غالب کو شدت سے اپنی انفرادیت کا احساس رہا۔

اردو شاعری نے بکمال خوبی ہر دور میں محبوب سے متعلق موضوعات کو سمیٹا اور سراہا ہے۔ وہ بہ الفاظ مسرت موہانی...... آئینے میں بہار حسن ہو...... بہ انداز مومن آواز پہ...... شعلہ سا لپک جائے، کا گمان ہو یا غالب کے اسلوب میں...... انداز بیاں اور...... سب کے سب پر کشش لوازمات کے طور پہ پیش ہوتے رہے ہیں اس ضمن میں مائل صاحب کا طرز ادا دیکھیے......

وہ تیرا حسن تو یوں تھا کہ جو بھی
تری آواز کے سر بھی غضب تھے

وہ جیسا خوش نوا ہے بولنے میں
اس دوں بولنے کو اور بیاں میں

سونامی سمندری زلزلے اور طوفان کی خفیف سی جھلک ذرا مختلف منظر کے ساتھ ان کے اس شعر میں جو دور ابتلاء کی تصویر کشی کامیابی سے کر رہا ہے۔

ہوا پانی بہائیں سب جنہیں اکثر
یہیں کچھ دور وہ کچے مکاں ہوں گے

زندگی اور اس سے جڑے ہوئے جذبات و احساسات ہمیشہ حساس ذہنوں کو مرغوب رہے ہیں اور زندگی کے دامن پر رجائی روپ سمٹا ہوا دیکھ کر متفکرانہ کیفیت ابھرتی ہے ایسے میں دیوں کو جلانا اور...... جلتے ہوئے دیکھنا بھی مثبت سوچ ہی کی خواہش ہے......

جو دروازہ گلی، گھر سب کو بھولی
خوشی آنے سے یوں تائب رہی کیوں
کہ ان میں دم ہے کتنا دیکھنے کو
دیئے کب سے ہواؤں میں رکھے ہیں

دعاؤں کے لیے دامن ہمیشہ پھیلے رہتے ہیں کون جانے کب کوئی دعا مستجاب ہو جائے...... پھر...... یادوں سے بھی کبھی مفر ممکن نہیں...... اور...... وہ خواب تو بہت ہی انمول ہوتے ہیں جن کی تعبیروں کا تانا بانا ملی شعور سے بنا ہوا ہو مائل صاحب کے یہاں یہ مختلف رنگ ان کے خاص زاویے سے ملاحظہ کیجئے:۔......

ہمیں تو ہی حرف، حرف خوشی ہو
کہ جو ہو سکے کچھ تو جزو دعا بھی!
بہ طور زاد رہ اس ہر سفر میں
ہمیں یادوں کی بس سوغات ہی ہو
ہیں جو بھی خواب میرے جو تصور
انہیں میں قوم کا حصہ بھی ہو گا

کسی بھی نظریے...... جدت آمیز رویے...... کو ابتداء میں بڑے کٹھن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے اور اس کی تفہیم کسی جوئے شیر سے کم نہیں کہ طرح طرح کے خطابات سے نوازا جاتا ہے...... لیکن...... ایک مقام پہ آ کے نہ صرف لوگ اس نظریے کے قائل ہو جاتے ہیں

بلکہ ہمنوائی میں اسی راہ پہ چل بھی پڑتے ہیں جبکہ بلاشبہ بوقت شام گھروں کو چمنیوں سے نکلتا دھواں ...... زندگی بسر کرنے کا ساماں اور آثار بھی ...... اسی لیے اپنی جانب توجہ مبذول کراتا ہے......

جدھر سارے ہی لوگ اب جا رہے ہیں
اسی جانب تو وہ پاگل چلا تھا
یہ ہر گھر سے اٹھتا دھواں لکڑیوں کا
یہ منظر بھی اپنی جگہ کیا حسیں ہے

تخلیق کار کا فن قابل اعتبار اور لائق اعزاز ...... اس کی انتھک محنت و لگن کا ثمر تو ہے ہی مگر اس ریاضت میں دعاؤں کا گہرا عمل دخل بھی رہتا ہے کیونکہ اس کارخانہ قدرت میں ہر ہر گام اتنا کچھ مشاہدہ کرنے کو ہے کہ انسان قدرت کاملہ کے ادراک پر حیران ہو کے رہ جاتا ہے۔

یہ کس حیرت سرا کا ہوں میں باسی
نظر جواب ادھر تو اب ادھر ہے

زندگی کا سفر ...... تحرک چاہتا ہے ...... مدام چلنے کا نام سفر ہے ...... تا کہ ...... مقصد حیات کی جانب پیش رفت ہو ...... اور ...... کل میں جزو ...... کا بھید پانے کی آگہی و دانائی نصیب ہو۔

سمندر سا آگے پڑا دیر سے ہے
یہ قطرہ بہت خود نما دیر سے ہے

دور رواں کا انسان اپنے مفاد و مطلب برآری میں اس درجہ منہمک ہے اور اس قدر ذہنی تناؤ و کھچاؤ کا شکار ہے کہ دل کو بھی داؤ پہ لگانے سے باز نہیں رہا اسی کے نتیجے میں گھروں سے سکون اور دلوں سے اطمینان رخصت ہوئے ...... جبکہ ہر صلح جو اور امن پسند انسان اس کا آرزومند رہتا ہے۔

کس فشار ذات کا یہ عہد ہے
جو نہ سالم دل ذرا پائے گئے

روایت پسندوں کے درمیاں اپنا جداگانہ راستہ نکالنا، جان جوکھم سے کم نہیں ...... مگر ایسا کرنے والے نہ صرف ...... انفرادیت پسندی کے علمبردار ہوتے ہیں بلکہ اس منفرد روش کے ساتھ اپنے پیغام کا بھی ابلاغ و فروغ کرتے ہیں۔

اسے ہی بڑا پاؤ گے فن میں مائل
جو اکثر روایت شکن بھی رہا ہو!

اخلاقی اقدار کا روبہ زوال ہونا بھی مفہوم کرتا ہے......اور......کم سواد و بے وقعت لوگوں کا صاحب علم وفن اور باعث توقیر انسانوں پر قابل ترجیح وحاوی ہونا بھی ہمیشہ تشویش کا موجب رہا اور ناقدری زمانہ پہ گلہ بھی......

قیمت ہر ہنر کی گھٹی اس طرح
کم ہنر جو بھی با اثر بھی ہوئے

ان کے شعری اسلوب میں کہیں کہیں استفہام بھی ملتا ہے جو حرکی تصور کو روشن کرتا ہے اور علامہ اقبال کے ستاروں سے آگے کے جہان کی جانب......دھیان مرتکز ہوتا ہے......

منتظر تارے رہے کس بات کے
کچھ تو آگے کو انہیں چلنا بھی تھا

کبھی کبھی سوچ کا تسلسل جو بھی اظہار کرواتا ہے اس میں اس درجہ ربط وضبط ہوتا ہے کہ اس کی تکرار محسوس ہوتی رہتی ہے......اور......کبھی سوچ کے ساتھ......مشاہدے کا ٹکراؤ......یوں بھی ہوتا ہے......

جسے اک سوچ میں لکھتا گیا تھا
وہی تحریر پھر ہر سو لکھی تھی
سوچا تو آرزوؤں کی نہریں رواں ملیں
دیکھا۔ تو زندگی بھی سسکتی سی پیاس تھی!

حیات انسانی سے پیوستہ اک خاص موضوع......اس کے اداس پہلو کا احساس کرنا ہے۔ اس موضوع پہ اکثر شعرا نے......اپنے اپنے اسالیب کے ساتھ......اشعار کہے ہیں......ناصر کاظمی بھی......زندگی کو سوچنے......اور......پھر اداس ہونے کا تزکرہ کرتے ہیں۔ مائل صاحب بھی اس موضوع پہ یوں شعر باندھتے ہیں......

چلو! اب کے نہ یوں اک گھات کر لیں
اداسی ہی کو اپنی ذات کر لیں!

جہاں تک خطوط کا تعلق ہے......یہ کسی کی زندگی میں اپنے اپنے تناظر کے ساتھ اہم ہوتے ہیں......اور گزرتے ہوئے وقت کے حالات وواقعات کو خود میں سموئے ہوئے......تاریخ کا حصہ بن جاتے ہیں۔

تمہیں کیا اک جہاں کو پڑھ رہا ہوں
تمہارے ہی عجب ان کچھ خطوں سے

اس شعری مجموعے میں...... پتھر...... نہایت اہم اشعاراتی روپ میں ابھرا ہے...... اور...... اس حوالے سے مختلف شعری خیال موزوں ہوئے ہیں...... جو متنوع کیفیات و محسوسات کے حامل ہیں......

ہم نے تو انگلیوں سے کہا پر وہ کہہ اٹھیں
پتھر پہ دل نشیں سا وہ پیکر بنائیں کیا!
پتھر سے تراشی تھی مگر جاگ اٹھی ہے
اک سانولی لڑکی مرے خوابوں میں بسی ہے
ہم تو برسائیں گے آوازوں کے پتھر عمر بھر
چاہے تم محلوں کی دیواروں کو اور اونچا کرو

جب یہ احساس فزوں ہو کہ زندگی ہمیں گزار رہی ہے تو اس کے برعکس یہ خواہش بھی شدید ہوتی ہے......

گزارے جس طرح یہ زندگی ہم کو
کبھی تو آپ بھی اس کو گزاریں ہم!

کتاب کی ابتدا میں...... "غزل بڑی کافر صنف سخن" کے زیر عنوان تخلیق کار نے اظہار خیال بھی کیا ہے۔ امید ہے کہ مائل صاحب کا شعری مجموعہ...... اپنی صوری و معنوی زیبائی سے...... ادبی حلقوں میں پزیرائی بھی پائے گا...... اور...... قارئین ادب کی جانب سے بھرپور مبارکباد کا استحقاق بھی رکھتا ہے۔!!

ممتاز محقق مشفق خواجہ کی یاد میں تعزیتی ریفرنس

بک ہوم رائٹرز کلب کے زیر اہتمام بک اسٹریٹ ۴۶۔ مزنگ روڈ لاہور میں ممتاز محقق، ادیب، نقاد، دانشور، شاعر اور کالم نگار جناب مشفق خواجہ (مرحوم) کی یاد میں ایک تعزیتی ریفرنس منعقد ہوا۔ اس کی صدارت بک ہوم رائٹرز کلب کے چیئرمین رانا عبدالرحمٰن نے کی۔

اجلاس میں ادیبوں، دانشوروں، شاعروں اور پبلشرز نے شرکت کی۔ اس تعزیتی ریفرنس سے پنجاب فورم کے چیئرمین پروفیسر عباس نجمی، سیکرٹری جنرل زاہد مسعود، ریاظ احمد، رانا عبدالرحمٰن، ڈاکٹر انور محمود خالد، صدیق جاوید، ایم سرور، وحید الرحمٰن خان، ڈاکٹر محمد سلیم ملک، زاہد حسن، محمد انور اور شبیر میواتی نے خطاب کیا۔

مقررین نے کہا، مشفق خواجہ بے پناہ خوبیوں کے مالک تھے۔ خواجہ صاحب اس عہد کے عظیم محقق، نقاد، دانشور اور اعلیٰ پایہ کے تنقید کار تھے۔ مشفق خواجہ کی وفات سے اردو ادب کو بہت بڑا نقصان پہنچا ہے جو مدتوں بعد بھی پورا نہیں ہوگا۔ مقررین نے کہا، مشفق خواجہ کو تحقیق اور تنقید کے علاوہ کتابوں سے بے پناہ محبت تھی۔ برصغیر میں جو بھی اچھی کتاب شائع ہوتی خواجہ صاحب کی لائبریری میں موجود ہوتی تھی۔ خواجہ صاحب کلام نگار کی حیثیت سے بھی پورے برصغیر میں شہرت رکھتے تھے۔ اجلاس میں مشفق خواجہ کے لیے فاتحہ خوانی کی گئی اور دعا کی کہ اللہ تعالےٰ مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور بیگم مشفق خواجہ اور عزیز و اقارب کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین!

اجلاس کے آخر میں بک ہوم رائٹرز کلب کے چیئرمین رانا عبدالرحمٰن نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ مشفق خواجہ اردو تنقید اور تحقیق کا ممتاز نام ہے۔ خواجہ صاحب کو مدتوں یاد رکھا جائے گا کیونکہ اردو ادب میں ان کی خدمات سند کا درجہ رکھتی ہیں۔

زاہد مسعود
سیکرٹری جنرل

رپورٹ: اعجاز رضوی

بزم شعر و نغمہ کی چیئر پرسن راحت زاہد کے ساتھ ایک شام

بزم شعر و نغمہ کی چیئر پرسن راحت زاہد نے کراچی میں جنم لیا۔ ۱۹۸۰ء میں برطانیہ سکونت اختیار کر لی۔ اردو زبان و ادب، شاعری اور نثر سے آپ کا پرانا تعلق ہے۔ راحت زاہد پہلی خاتون اسپیشل جرنلسٹ اور شاعرہ ہیں جن کا اپنا مجموعہ کلام ''اداس گلیوں میں'' چھپ چکا ہے۔ راحت زاہد بزم اردو سکاٹ لینڈ پاکستان فاؤنڈیشن سکاٹش پاکستانی ایسوسی ایشن پاکستانی وومنز ویلفیئر ایسوسی ایشن میں اپنے کام اور خدمات کی بدولت متعدد بار ایوارڈ حاصل کر چکی ہیں۔

گزشتہ دنوں جب راحت زاہد لاہور تشریف لائیں تو ادبی ثقافتی تنظیم ادب دوست کے چیئر مین اے جی جوش نے ان کے اعزاز میں ایک بھرپور تقریب کا اہتمام کیا۔ تقریب کا پہلا حصہ بزم شعر و نغمہ کے وفد کے تعارف اور ان کے علمی و ادبی اور ثقافتی کاموں سے آگاہی کے لیے تھا۔ جبکہ دوسرے حصے میں ایک محفل مشاعرہ کا اہتمام کیا گیا۔ اس تقریب اور اس مشاعرے کی مہمان اعزاز محترمہ راحت زاہد صاحبہ تھیں جبکہ صدارت کے فرائض، اردو غزل کے معروف شاعر اور دانشور جناب شہزاد احمد نے کیے۔

مشاعرے کی میزبانی کے فرائض، اے جی جوش اور خالد احمد نے نبھائے۔ مشاعرے میں جن لوگوں نے اپنا کلام سنایا۔ ان میں آغا نثار، اختر شمار، سردار سوز، اشرف جاوید ناہید، شاہد نجیب احمد، سعود عثمانی، خالد احمد، آپا نسیم اختر، شہناز مزمل، صغرا صدف، شاہینہ نزہت، زاہدا میر اور میزبان اے جی جوش کے علاوہ مہمان اعزاز راحت زاہد نے بھی اپنا کلام سنایا۔

راحت زاہد کی ایک غزل

○

شاعری مجھ کو راس آنے لگی
اُس کی پرچھائیں پاس آنے لگی

برگ، بادل، گھٹا سب اچھے لگیں
سوکھے پھولوں سے باس آنے لگی

دیکھ کر اس کی شبنمی آنکھیں
خشک ہونٹوں پہ پیاس آنے لگی

وقتِ رفتہ پلٹ کے دے نہ صدا
ہم کو جینے کی آس آنے لگی

اس نے دیکھا جو پیار سے راحت
جسمِ بے جاں میں سانس آنے لگی

معروف گلوکار ڈاکٹر امجد پرویز نے موقع پر ہی کمپوز کر کے سنائی۔ اور اپنی اس کاوش پر بھرپور داد وصول کی۔ اس محفل شعروسخن میں قتیل شفائی کے صاحبزادے نوید قتیل نے کلام قتیل پیش کیا۔ محفل کے اختتام پر اے جی جوش کے جانب سے راحت زاہد کے اعزاز میں شاندار دعوت کا اہتمام کیا گیا۔

گلاسگو (یو کے) میں مقیم معروف شاعرہ اور بزم شعر و نغمہ کی چیئرپرسن راحت زاہد کے اعزاز میں منعقدہ شعری نشست کے موقع پر مدیر ادب دوست اے جی جوش سامعین سے اُن کا تعارف کرواتے ہوئے۔

شعری نشست کے شرکاء
دائیں سے:۔ مسز نوید قتیل، شائستہ نزہت
زاہد علی خان، راحت زاہد، اے جی جوش
شہناز مزمل، صغریٰ صدف اور
شہزاد احمد

دیگر شرکاء:۔ (دائیں سے) نسیم اختر
ڈاکٹر امجد پرویز، شہزاد (گلاسگو)
شائستہ نزہت، راحت زاہد
شیخ محمد اشرف، اے جی جوش
نوید قتیل اور ڈاکٹر زاہد امیر

بزمِ شعر و نغمہ کے وائس پریذیڈنٹ
شیخ محمد اشرف اپنی تنظیم کے
اغراض و مقاصد سامعین کو بتا
رہے ہیں۔ —

(دائیں سے) ڈاکٹر سردار سوز، شہزاد
(جنرل سیکرٹری) ڈاکٹر زاہد امیر
راحت زاہد، زاہد علی خاں (خزانچی)
اے جی جوش، شیخ محمد اشرف (وائس
پریذیڈنٹ) اور خالد احمد

چیئرپرسن: راحت زاہد مدیر ادب دوست
اے جی جوش کو اپنی تنظیم بزمِ شعر و نغمہ
کی جانب سے سوینیئر پیش کرتے
ہوئے۔

فراز سعید

گوجرانوالہ میں نسیم سحر اور شوکت علی ناز کے ساتھ تقریبات

سعودی عرب کے شہر جدہ میں مقیم ممتاز پاکستانی شاعر اور ایک سہ ماہی ادبی جریدے کے مدیر نسیم سحر گزشتہ دنوں پاکستان کے دورے پر آئے تو گوجرانوالہ کے معروف شاعر، ادیب اور ماہر امراض جلد ڈاکٹر سعید اقبال سعدی نے انہیں گوجرانوالہ میں ایک تقریب میں آنے کی دعوت دی جو نسیم سحر نے بخوبی قبول کر لی اور مرکزی سفینہ ادب کے زیر اہتمام سفینہ ادب ہال میں ''ایک شام نسیم سحر کے نام'' ایک خوبصورت تقریب منعقد ہوئی جس کی صدارت گوجرانوالہ کے ممتاز شاعر قاضی اعجاز محور نے کی جبکہ بطور مہمان خصوصی نسیم سحر سٹیج پر رونق افروز تھے ان کے ساتھ مہمان اعزاز کے طور پر نسیم سحر کے ساتھ آنے والے مہمان عارف خان سٹیج کی رونق کو دوبالا کر رہے تھے۔ نظامت کے فرائض سفینہ ادب کے معتمد اور ممتاز شاعر و ادیب ڈاکٹر سعید اقبال سعدی اور میزبان تقریب کے ذمہ تھے جسے انہوں نے اپنی مہارت سے خوبصورتی سے انجام دیا۔ محترم نسیم سحر کی شخصیت اور ان کی شاعری پر بات کرتے ہوئے ڈاکٹر سعید اقبال سعید نے کہا کہ میں گزشتہ بیس سالوں سے نسیم سحر کی شاعری کو پڑھ رہا ہوں اور ان کی شاعری کا گرویدہ ہوں ان کو پڑھ کر ان کے قاری کو شعراء لکھنے کی ترغیب ملتی ہے۔ ان کے خیالات اچھوتے اور قلم میں روانی ہے ان کا قاری ان کو پڑھ کر مزید پڑھنے کی خواہش کرتا ہے۔ ڈاکٹر سعید اقبال سعدی نے کہا جس طرح دیار غیر میں بیٹھ کر نسیم سحر ادب کی خدمت کر رہے ہیں۔ صحیح معنوں میں جوئے شیر لانے والی بات ہے دیار غیر میں جہاں اردو کی کمپوزنگ ممکن نہیں وہاں سے ایک ضخیم اور پرکشش پرچہ نکالنا نسیم سحر جیسے لوگوں کا ہی کارنامہ ہے۔ جسے اللہ تعالیٰ نے ایسے بڑے کاموں کے لیے پیدا کیا ہوا ہے۔ انہوں نے کہا کہ مجھے نسیم سحر سے دوستی اور تعلق پر فخر ہے۔ عارف خاں نے نسیم سحر کی شخصیت پر بات کرتے ہوئے کہا کہ یہ میرے بڑے بھائی اور خوبصورت شاعر اسد محمد خاں کے دوست ہیں۔ میں ان کا بے حد مداح ہوں اور ان کی ثابت قدمی کے لیے دعا گوں ہوں بلاشبہ ایسے حوصلہ مند لوگ ہی ادب کی بقا کے ضامن ہیں۔ پروفیسر قاضی اعجاز محور نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ ''سحاب'' کو جس شان و شوکت سے نسیم سحر نکال رہے ہیں یہ میرے لیے بھی فخر کی بات ہے کہ ایسے جریدے میں میرا کلام بھی چھپتا ہے میں نسیم سحر کو ہر اہم ادبی پرچے میں ایک اہم رکن کے طور پر پاتا ہوں تو مجھے ان کے ادب سے لگاؤ پر رشک آتا ہے ایسے لوگوں کے دم قدم سے ادب آباد ہے۔ انہوں نے ڈاکٹر سعید اقبال سعدی کو مبارکباد دی کہ انہوں نے ادب کے اس ستون کے ساتھ شام منا کر ادب کی آبیاری کے لیے اپنے مخلص ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ جناب نسیم سحر نے اپنی تقریر میں اپنے دیار غیر

بسلسلہ ملازمت مقیم ہونے اور اپنے ادبی ذوق پر روشنی ڈالی۔ انہوں نے کہا کہ ''مسحاب'' نکال کر انہیں دلی سکون اور روحانی خوشی حاصل ہوتی ہے وہ اپنے آپ کو ادب کا ایک کارکن تصور کرتے ہیں۔ انہوں نے دیار غیر میں بیٹھ کر ضخیم اور بھرپور جریدہ نکالنے میں اپنی دشواری کا ذکر کیا اور کہا کہ وہ ان دشواریوں کے باوجود ادب کے لیے اپنی خدمات تا حیات جاری رکھیں گے ادب انکا اوڑھنا بچھونا ہے اور یہ کام وہ اپنی خوشی کے لیے اور سکون کے لیے کرتے ہیں حال میں شریک شرکاء کے سوال و جوابات کے سیشن میں جناب نسیم سحر نے کہا کہ وہ ملازمت سے ریٹائرمنٹ کے بعد اگر پاکستان واپس آگئے تو ادب کی خدمت کے لیے خود کو وقف کر دیں گے۔ نسیم سحر نے لوگوں کی فرمائش پر اپنا ڈھیروں کلام سنایا اور حال میں موجود شرکاء سے دل کھول کر داد وصول کی۔ انہوں نے سفینہ ادب کی طرف سے اس شام کے منائے جانے پر دلی شکریہ ادا کی اور عارف خان کی کاوشوں کو سراہا جو انہیں لے کر مقام تقریب پر پہنچے تھے۔ اس تقریب کی شام گوجرانوالہ میں بادلوں کا راج تھا اور سڑکیں گیلی اور فٹ پاتھ گارے سے اَٹے ہوئے تھے اس کے باوجود نسیم سحر کی شام کی کشش حاضرین تقریب کو کھینچ لائی تھی بلاشبہ یہ تقریب نا صرف نسیم سحر کی شاعری میں بلکہ سفینہ ادب کے زیر اہتمام منائی جانے والی تقریبات کی شاعروں میں ایک یادگار شام تھی۔

مرکزی سفینہ ادب گوجرانوالہ کے زیر اہتمام ماہانہ محفل مشاعرہ سفینہ ادب ہال میں منعقد ہوئی اور ساتھ ہی قلم میں مقیم معروف شاعر شوکت علی ناز کے ساتھ ایک شام منائی گئی۔ جس کی صدارت کویت پلٹ مقبول شاعر باقی احمد پوری نے کی جبکہ مہمانان خصوصی شوکت علی ناز اور جدید لہجے کے شاعر افضل گوہر راؤ تھے نظامت کے فرائض سفینہ ادب کے معتمد ڈاکٹر سعید اقبال سعدی نے ادا کیے اس محفل مشاعرہ میں جن شعراء نے اپنا کلام سنایا ان میں صاحب صدارت اور مہمانان کے علاوہ پروفیسر قاضی اعجاز محور، پروفیسر عبداللطیف بھٹی، پروفیسر ظفر منصور، پروفیسر فیض رسول فیضان، چوہدری زاہد ممتاز، غلام زبیر نازش، عطاء اللہ عزیز، عبدالباسط، عمران ہاشمی، اختر خیالی، سید اعجاز حسین، عطاء اللہ بھٹی، باؤ رمضان شاہد، نذیر احمد بے نظری، غلام عباس، عالمگیر خیالی، فرزند علی شوق، عبدالماجد تنہا، معصوم رضوی، غلام رسول ساقی، جاوید اقبال انجم، حفیظ اللہ خان اور دیگر شعراء کے نام شامل ہیں۔ تقریب میں گزشتہ ماہ انتقال کر جانے والے اہل قلم مشفق خواجہ غضنفر علی ندیم اور صدیق ندیم کے لیے دعائے مغفرت کی گئی مہمانان کو سفینہ ادب کی یادگاری شیلڈز دی گئیں۔ ڈاکٹر سعید اقبال سعدی نے مہمانان خصوصی شوکت علی ناز اور افضل گوہر راؤ کا مفصل تعارف کروایا۔ یہ ماہانہ محفل مشاعرہ ایک یادگار تقریب تھی۔

گوجرانوالہ، جدہ کے نسیم سحر کے اعزاز میں ڈاکٹر سعید اقبال سعدی اور قاضی اعجاز محور سٹیج پر بیٹھے ہیں۔

مرکزی سفینۂ ادب کے مشاعرہ میں ظفر منصور، ڈاکٹر سعید اقبال سعدی باقی احمد پوری، شوکت علی ناز اور افضل گوہر سٹیج پر بیٹھے ہیں۔

گوجرانوالہ کے ایک مشاعرہ میں ڈاکٹر سعید اقبال سعدی انصر علی انصر، عرفانہ امر اور قمر رضا شہزاد نمایاں ہیں۔

تاثرات

گرامی قدر جناب اے جی جوش!

تسلیم! ادب دوست کی راہ میں آنکھیں بچھائے امید وبیم کی حالت میں بیٹھا رہا کہ ۱۱ مارچ کو مژدۂ جانفزا املا۔ ''ادب دوست'' میرے ہاتھ میں گلدستہ نوبہار کی طرح خوشبو بکھیر رہا تھا اور میں صفحہ اول پر نظریں جمائے احباب کے نام پڑھنے لگا۔ سرسید اور اردو ادب پر جمیل یوسف کا مضمون جہاں ایک طرف سرسید کی ہمہ جہت شخصیت، ان کے عظیم کارناموں، علمی اور ادبی خدمات اور منفرد اسلوب نگارش سے متعارف کروانے کا حوالہ بنا وہاں ان کے احسانات کا ذکر بھی آیا۔ البتہ ایجاز و اختصار کے باعث تشنگی محسوس ہوئی۔ اس میں شک نہیں کہ سرسید نے ہر نوع کے مضامین لکھے اور لکھوائے اور یہ ثابت کیا کہ اردو زبان ہر طرح کے مطالب اور علمی اور سائنسی مضامین کا احاطہ کر سکتی ہے، انہوں نے اس زمانے میں ہومیو پیتھک پر رسالہ مرتب کیا اور اسی طرح اردو میں جدید سائنسی انکشافات کو اردو زبان میں بیان کرنے کی راہ ہموار کی۔ جمیل یوسف سے امید کی جا سکتی ہے کہ وہ آئندہ بھی شاعری کے ساتھ ساتھ نثری تخلیق کا دامن بھی ایسے عمدہ مضامین سے بھرتے رہیں گے۔

ادب دوست میں مستقل لکھنے والوں اور اسی بساط نظم پر نو واردوں کی معیاری تخلیقات کی سجی ہوئی کہکشاں دیکھ کر یقین ہو جاتا ہے کہ آپ کے میکدۂ شاعری میں جوش و جذبہ کے ساتھ رندانِ باصفا کا اضافہ بھی ہو رہا ہے۔ جمشید مسرور کے والد محترم ڈاکٹر مسرور کی صحبت میں اختر جعفری، عاشور کاظمی، صلاح الدین ناسک، حیدر نہٹوری اور میں نے تین چار برس گزارے، وہ ہمیں دیکھتے ہی اپنا یہ شاعر سنا کر آغاز گفتگو کرتے۔

رندوں کے میکدے میں وہ آئیں ہزار بار
لیکن یہ شرط ہے کوئی بے وضو نہ ہو

''ادب دوست'' کی بزم میں بھی باوضو ہونا ضروری ہے۔ مشکور حسین یاد کا یہ شعر آپ کی نذر کرتے ہوئے آگے بڑھتا ہوں۔

ہم دیکھ کے خود کو نہ سنبھل پائے کسی طور
آئینے۔ نے غارت گر حیرت ہمیں رکھا

مختصر یہ کہ غزل کا دامن موسم گل میں کچھ زیادہ ہی آب و تاب دکھا رہا ہے اور آپ کی وضع داری یہ ہے کہ سب سے آخر میں اپنی غزل رکھی۔ اس مرتبہ ڈاکٹر سعید اقبال سعدی نے اپنی غزل سے محروم رکھا...... آخر کیوں؟

حسن عسکری کاظمی

محترم جناب اے جی جوش صاحب!

السلام علیکم! مارچ ۲۰۰۵ء کا ''ادب دوست'' ملا۔ تاثرات کے باب میں برادرم نیاز احمد صوفی نے گلہ کیا ہے کہ برادر محترم جناب پرویز بزمی نے لکھا تھا کہ جمیل یوسف نے نیاز احمد صوفی کو سعادت حسن منٹو کی مثل قرار دے کر انہیں خوش گمانی میں مبتلا کرنے کی کوشش کی ہے۔ صوفی صاحب کا گلہ بجا ہے۔ پرویز بزمی صاحب مجھے پچھلے تیس بتیس سال سے جانتے ہیں اور بہت قریب سے جانتے ہیں، انہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ میں ایسے کام نہیں کیا کرتا۔ کسی کو خوش گمانی یا خوش فہمی میں کبھی مبتلا نہیں کرتا۔ اسی لیے تو

اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش
میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

جب تک کسی کی تحریر پر میں جھوم نہ اٹھوں میں اس کی تعریف نہیں کرتا۔ ہاں جو تحریر میرے دل کو لگے اور مجھے مسرت و انبساط سے ہمکنار کر دے میں اسکی تعریف و توصیف میں بخل سے کام نہیں لیتا۔ اس ضمن میں میرا وطیرہ یہ ہے۔

جب کوئی تازہ شگوفہ پھوٹا
کی گلستاں میں منادی ہم نے

نیاز احمد صوفی کا ہر افسانہ مجھے سعادت حسن منٹو اور مو پیساں جیسے افسانہ نگاروں کی یاد دلاتا ہے۔ بڑے عرصے بعد اردو ادب کو ایک ایسا افسانہ نگار ملا ہے جو صحیح معنوں میں مختصر افسانے کے فن کا ماہر ہے۔ جس کے افسانے کے پہلے دو تین فقرے ہی قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں اور افسانہ ختم کرنے کے بعد بھی قاری اس کے طلسم میں قید رہتا ہے۔ میں تو نیاز احمد صوفی کے افسانے پڑھ کر فیض کا یہ شعر گنگنانے لگا ہوں۔

پھر نظر میں پھول مہکے دل میں پھر شمعیں جلیں
پھر تصور نے لیا اس بزم میں جانے کا نام

گویا میری جوانی لوٹ آتی ہے۔ والسلام

آپ کا مخلص...........جمیل یوسف

محترم اے جی جوش صاحب!

محبتیں!

گزشتہ کئی ماہ سے ''ادب دوست'' کے لیے نہ کچھ لکھ سکا ہوں اور نہ بھجوا سکا ہوں۔ دراصل وقت کی اپنی ایک دھار ہوتی ہے۔ آدمی وقت کی دھار میں بہہ جاتے تو کچھ پتہ نہیں چلتا، کہاں چلے جائے۔

''ادب دوست''، تسلسل سے موصول ہو رہا ہے جس کے لیے میں آپ کا حد درجہ ممنون و مشکور ہوں۔ ڈاکٹر سعید اقبال سعدی صاحب سے اکثر ملاقات رہتی ہے۔ دراصل سعدی صاحب گوجرانوالہ کی فعال ترین ادبی شخصیت ہیں۔ ان سے مل کر بے شمار دکھ دور ہوتے ہیں۔

''ادب دوست'' کے لیے کچھ تازہ نگارشات ارسال کر رہا ہوں، قریبی اشاعت میں جگہ دیجئے گا۔ نوازش ہوگی۔ امید ہے آپ عافیت سے ہوں گے۔ کبھی کسی محفل میں یاد کیجئے گا، بندہ کی قدر افزائی ہوگی۔

آپ کا اپنا............سرفراز تبسم

محترم و مکرم محتشم و معظم جناب اے جی جوش، سلامت باشید

یہ رسالہ صرف معنوی اعتبار سے لائق مطالعہ ہے لیکن صوری لحاظ سے اغلاط کی پوٹ ہے۔ یہ بات گزشتہ کئی ماہ کے شماروں سے ظاہر ہے۔ راقم سب کو پڑھتا ہے، کہاں تک پروف ریڈنگ کی نشاندہی کی جائے۔

اس مرتبہ اپنے قطعات میں پہلا قطعہ میں ''دیکھ'' ہونا چاہیے، کمپوزر نے ''دیکھو'' کر دیا اور پروف ریڈر نے پاس کر دیا۔

تیسرے قطعہ میں ''پست ہمت'' کے لفظ ہیں، چست ہمت لکھا گیا جبکہ ایڈیٹر یا پروف ریڈر کو اتنا تو احساس ہونا چاہیے کہ یہاں پست ہمت ہونا چاہیے یا چست ہمت۔ اس قطعے کے تیسرے مصرعے میں ''سر سے نہیں ٹل سکتا'' کی جگہ ''مرے نہیں ٹل سکتا'' لکھ دیا۔

چوتھے قطعے میں دوسرے مصرعہ میں ''خوگر'' ہونا چاہیے نہ کہ ''نوگر''

پانچویں قطعہ کا پہلا مصرعہ ''مخلص و حق آشنا احباب کی تعظیم میں''

چھٹے قطعے میں ''حیات'' کی جگہ ''حبات'' لکھ مارا۔

ساتویں قطعے کے دوسرے مصرعہ میں ''سنگ لے چلے تھے'' نہیں بلکہ ''سنگ لے کے چلے تھے'' ہونا چاہیے۔

آٹھویں قطعے میں ''جو ہم نفس بھی نہیں ہے'' ہونا چاہیے۔

محترمہ مسرت جبیں زیبا کے قطعات کی اغلاط:

موصوفہ کے ایک شعر میں ''با'' کی جگہ ''بہ'' لکھ دیا جبکہ ساقط الوزن ہے۔

دوسرے قطعہ میں ''انہوں نے'' کی جگہ ''لوگوں نے با خوف ضرر''

مادی مشدد ہے، جبکہ مادی کتھا یعنی نہر کے مقابل؟

اسی شعر کے دوسرے مصرعہ میں لکھنا چاہیے تھا...... ''یہ تو ہیں مشغول نغمات و طرب خاموش ہیں''

ایک اور شعر میں ''ہے'' کی جگہ ''بے کیا عجب خاموش ہیں'' لکھا گیا۔

تقیہ ساکن لفظ نہیں ہے تشدید کے ساتھ ہے..... تقیّہ

اس قطعے کا تیسرا مصرعہ..... عراق جزم کے ساتھ تو استعمال ہو ہی نہیں سکتا۔

"بے حسی اتنی بڑھی عراق بھی لقمہ ہوا"

آخری شعر میں بھی مادی کا استعمال بغیر تشدید غلط ہے۔

جوش صاحب! بندہ عربی وفارسی کا عالم ہے۔ علم عروض خوب پڑھا ہے۔ غالباً اس کی تو آج کل کوئی ضرورت ہی نہیں۔ فارسی، عربی اور فلسفہ نصابوں سے نکال دیئے گئے۔ زبان کا غلط استعمال بالخصوص اردو ادب کے ساتھ زیادتی کے مترادف ہے۔

راقم کے پاس دوسرے جرائد بھی آتے ہیں ان میں مدیران گرامی سنبھل کر تخلیقات شامل کرتے ہیں لیکن اوزان، پروف کی اغلاط ان میں بھی نہیں ہوتی۔ مثلاً ماہنامہ الحمرا، ماہنامہ شام وسحر ہفت روزہ جدوجہد، منشور کراچی، بلکہ لاہور کے مضافات سے جو جرائد آتے ہیں، سبحان اللہ، سبحان اللہ..... کیا مضامین نظم ونثر، کیا تبصرے، کیا محاکے۔ یہ بات میں یوں کہہ رہا ہوں کہ اغلاط سے میری جان جاتی ہے۔ آپ دو آدمی بشمول ڈاکٹر سعید اقبال سعدی "ادب دوست" کے ہر ماہ ۶۴ صفحات نہیں پڑھ سکتے۔

اردو ادب کا محض یہ مقصد نہیں کہ افسانے، آزاد نظمیں، غزلیں وغیرہ چھپ جائیں۔ ادب کا مقصد توسیع نظر اور صحت زبان بھی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر تخلیق کار خود باشعور ہے تو وہ صحیح کو غلط دیکھ کر کبھی خوش نہیں ہوسکتا بلکہ مصنف اور ادارے کے منہ پر کالک ملنے کے مترادف ہے۔ اس مرتبہ "ادب دوست" میں بڑے معرکے کے مضامین نظم ونثر ہیں۔ کرامت بخاری جیسے شعراء آزاد نظموں میں بڑی دانش بکھیر رہے ہیں۔

دوسری گزارش بصد عجز وادب..... آپ سینئر شعراء کا خیال نہیں رکھتے۔ سنیارٹی عمر کے اعتبار سے نہیں ہوتی، تخلیقی فکر کے ساتھ آتی ہے۔ اس بات کو ضرور ملحوظ رکھنا چاہیے۔ بعض سینئر شعراء بھی یہ نہیں سوچتے کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں اور کیوں کہہ رہے ہیں۔ سال میں ایک دو غزلیں کچھ نظمیں ہو جائیں تو قاری کو کچھ حاصل بھی ہو۔ بور شاعری کے ساتھ جو مجموعے عوام کو دیئے جاتے ہیں ان کا آخر فلسفہ کیا ہے۔ اس سے بہتر ہے کہ ہمارے شعراء کمپیوٹر سیکھیں اور اگر عالم فاضل ہیں تو تاریخ وثقافت پر کچھ کام کریں۔

راقم نے ۱۹۸۶ء سے اب تک محض خدمت علم وادب کے سلسلے میں چوبیس کتابیں لکھیں، معاوضے کا کبھی خیال نہیں آیا۔ اب زندگی کی آخری کتاب "لغات فلسفہ" جو ۱۹۹۰ء سے شروع کی، جس کے مسودے کو دنیا بھر کے سکالرز نے پسند کیا۔ یہ شاعری نہیں تھی، تحقیق اور ڈکشنری آف فلاسفی کو اردو میں منتقل کرنا خالہ جی کا گھر نہیں تھا۔

ادارہ مقتدرہ قومی زبان نے جب اسے دیکھا تو کہا تھا، یہ کام مقتدرہ نے آپ کو تفویض کر دیا ہے جلد مسودہ بھجوائیں، ادارہ کی طرف سے کنٹریکٹ فارم منسلک ہے۔

عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے شعراء ترجمہ اور تحقیق کیوں نہیں کرتے، مطالعہ کریں۔ ابھی ایک فلسفہ کی کتاب ملی ہے۔ Great Philosphy (عظیم فلسفی)............ انسان دنگ ہے کہ دنیا میں کتنے عظیم فلاسفر پیدا ہوئے اور یورپ کس قدر قلم پرور ہے کہ دنیا بھر کو علم بانٹتا پھرتا ہے لیکن یورپ کی کتابیں پڑھنے کے لیے انگریزی مضبوط ہونی چاہیے اور ہم حساب، انگریزی میں بے حد کمزور ہیں کیونکہ یہ ہماری زبان نہیں۔ ہماری زبان فارسی، عربی، پنجابی، سرائیکی، سندھی، پوٹھوہاری ہیں۔ انگریزی کے نقطہ نظر سے ہم گاؤزبان ہیں۔ گائے کے پرستار تو آپ کے یہاں دبادب آ رہے ہیں۔ گائے ماتا بڑا پیارا جانور ہے۔ اگر شریف بیوی کو گائے ماتا سے تشبیہ دی جائے تو عاقبت میں بڑا ثواب ملے۔

جوش صاحب قبلہ! بندہ شاعر وائر نہیں ہے بکواس کر لیتا ہے، شاعری کلاسیکی شعراء کر گئے۔ مختصر مرثیے میں بھی سید وحید الحسن صاحب نے شاعری کی ہے۔ حال ہی میں ان کی کتاب "العطش" آئی ہے جس میں مرثیہ عروج پر ہے۔ طباعت و کتابت دیکھ کر آنکھوں کو ٹھنڈک ملتی ہے۔ (قیمت ۹۵۰ روپے ہے) روزانہ مطالعہ کرتا ہوں۔ واقعہ کربلا پر زار و قطار رو لیتا ہوں۔

ڈاکٹر خیال امروہوی

برادرم اے جی جوش صاحب!

السلام علیکم!

میری بیگم مسز صوفی صفدر ۲۶ فروری ۲۰۰۵ء کو دنیائے فانی سے دار جاودانی کو رخصت ہوئیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

صوفیہ انگریزی ادب کی طالبہ تھیں اور گھر کے حوالے سے میری شاعری کی سب سے بڑی محرک تھیں۔ شعر و ادب کے حوالے سے انہوں نے مجھے ہمیشہ خوبصورت اور وقیع رائے سے نوازا۔ جس سے مجھے اپنی شاعری کی نوک پلک درست کرنے میں بڑی مدد ملی۔

آپ سے اور آپ کے علاوہ دیگر احباب سے مرحومہ کے لیے دعائے خیر گی درخواست ہے۔ ایک نظم جو میں نے ۱۸ سال قبل اپنی بیگم کی بیماری کے آغاز میں لکھی تھی، ارسال خدمت ہے۔

ادب دوست میں اسے ضرور جگہ دیں۔

مخلص............ سید صفدر حسین جعفری

☆☆☆

فقیر اجمل جنڈیالوی

نعت ختم المرسلین ﷺ

تیرے در تے آن کھلوتاں بن کے اک سوالی
میرے سر تے تان دیو چا اپنی کملی کالی

تیرے روضے دی میں چماں پاک سنہری جالی
جتھے تیرے گولیاں رو رو پایا رتبہ عالی

ایس جہان دے اندر دردی باجھ تیرے نہ کوئی
میرے لیکھ دی اک اک منزل تیری ڈٹھی بھالی

اپنے کول بلا کے مولا کر دے سدھر پوری
میں وی کتناں تائیں بھر لاں اپنی جھولی خالی

جسراں خنسا ؓ اتے تیرے کرم دی ورکھا ہوئی
میں وی نعت لکھن دی خاطر اپنی جندڑی ڈھالی

توں ان ڈٹھے رب نوں منن والا کم سکھایا
تیرے بولے اک اک اکھر نیں میری لج پالی

ہر اک قوم تے امت دا توں رہبر بن کے آیا
کدی وی تیری امت نے گل بات نہ تیری ٹالی

ہن تیکر وی میتوں نعت لکھن دا چج نہ آیا
خورے میرے علم دے رکھ دی سک گئی اے ہر ڈالی

جی کردا اے ہن تاں وساں شہر مدینے جا کے
ویکھ ویکھ نہ رجے اجملؔ دے دے اک وکھالی

روحی کنجاہی

نعت

اوہدے ملنگ تے اوہدے قلندر چن تے سورج
اوہدے بلال ؓ تے اوہدے ابوذر ؓ چن تے سورج

اوہدے صحابہ دے وچ شامل ایہ وی رہے نیں
اوہدے گن گاندے نیں فر فر چن تے سورج

اوہنوں ویکھن والیاں نوں میں ویکھ کے جیواں
اوہدی یاد دلان برابر چن تے سورج

نھیرا انھا بھاویں اوہدا منکر ہووے
ہو نہیں سکدے کدی وی کافر چن تے سورج

اوہدے نوری سائے کولوں بھر بھر اکھیاں
کرناں ونڈدے پھردے گھر گھر چن تے سورج

اوہدی خاطر ہر پاسے پھٹیاں رشنایاں
دین گواہی سارے پیمبر چن تے سورج

اوہدے ساہواں دی خشبو ہر پھل چوں آوے
اوہدے مکھ دا لیکن منظر چن تے سورج

اوہدے فیضاں دی کیہ جھلک وکھاوے کوئی
جس دے ہوون نوکر چاکر چن تے سورج

کنی اچی گل اے اوہدی ہر گل روحیؔ
جس دا کلمہ پڑھدے پتھر چن تے سورج

کنول مشتاق

بابل ساہنوں کھیڈن دے

(خواتین دے عالمی دیہاڑ تے کڑیاں دا گاون)

بابل ساہنوں کھیڈن دے
کھیڈن دے دن چار
ایہ گڈیاں پٹولے
ایہ ککلی ایہ تھال
ایہ ٹپ ٹپ ویہڑے
ایہ سرا ایہ تال
اج نہیں تے کل
اساں لے جانے نال
بابل ساہنوں کھیڈن دے
کھیڈن دے دن چار
ایہ چڑیاں دے چنبے
بن کونجاں دی ڈار
لمی مار کے اڈار
کس گھر جاواں گے؟
بابل ساہنوں کھیڈن دے
کھیڈن دے دن چار

بابل ساہنوں کھیڈن دے
کھیڈن دے دن چار
دو اپر دو بیٹھ
دو دیور دو جیٹھ
پنج ست نناناں
کدی ایس گھر جاناں
کدی اوس گھر جاناں
کدی کنگھی کدی پٹی
کدی خصماں دی چٹی
کدی جمن ودھائی
کدی مویاں دی مکانی
کدی سس دا ستاپا
کدی سوہرے دا سیاپا
بابل ساہنوں کھیڈن دے

بابل ساہنوں کھیڈن دے
کھیڈن دے دن چار
دو بچے دو کھبے
جہڑے دکھ سکھ لبھے
جھولی پالینے سبھے
لانے بلھاں تے ہاسے
جیویں غم نوں پتاسے
جو کسے نے وی کہنا
اساں بس سن لینا
سارا اوہناں دا کمال
ساڈی کیہ اے مجال
اسیں مجھیں اسیں گائیں
بس آئیں بائیں شائیں
نہ ایتھے ساڈے بول
نہ اوتھے ساڈے تول
بابل ساہنوں کھیڈن دے
کھیڈن دے دن چار

بابل ساہنوں کھیڈن دے
کھیڈن دے دن چار
دو آر دو پار
وچ ندی وگ دی
سونہہ تیری پگ دی
ترنے نوں کہو گے
تاں تر جاں گے
مرنے نوں کہو گے
تاں ڈب مر جاں گا
بابل ساہنوں کھیڈن دے
کھیڈن دے دن چار

امین خیال

هر اک جا ای تیری جا اے میرا کیہ اے
تیری دھپ تے تیری وا اے میرا کیہ اے
اوتھوں دی وی ہر اک شے دا مالک توں ایں
ایتھوں دا وی سب تیرا اے میرا کیہ اے
پانی مٹی اگ ہوا دی کھیڈ اے ساری
ہر شے وکھری جدا جدا اے میرا کیہ اے
روح اے نور اے جو کجھ وی اے تیری شے وے
میرے کول تے اک ڈھانچا اے میرا کیہ اے
میں واں تیرا بندہ میتھوں پچھدا کیہ ایں
تیری تھاں تھاں ای پوجا اے میرا کیہ اے
کوجھ زمانے بھر دے سوہنیا میرے وچ نیں
تیرا سارا کجھ اچھا اے میرا کیہ اے
والعصر نوں پڑھ کے سوچیں پے جاناں واں
خورے کتھوں ایہ گھاٹا اے میرا کیہ اے
جے کدھرے کوئی میرے متھے کالک لگی
تیرے اتے ای دھبا اے میرا کیہ اے
تیرا کم نہیں پیار اچ وادھے گھاٹے کرنا
پیار وی تیرا ای سودا اے میرا کیہ اے
جے میں بھل کے کھٹ وی لئی کوئی سوبھا جگ تے
ایہ تیری ای جگ سوبھا اے میرا کیہ اے
میں نہیں کجھ وی کیتا میتھوں سونہہ چا لے
سب قصور خیالے دا اے میرا کیہ اے

اسد عباس خان

☆

رات جگاون آ گئی رات
زخم سہاون آ گئی رات
اج فر دکھ دی تال دے اتے
گیت سناون آ گئی رات
تعبیراں دا اے رب ہی راکھا
خواب وکھاون آ گئی رات
گھپ ہنیرے دینہہ دے دن
چن ورتاون آ گئی رات
حالیں دینہہ دی اکھ نہیں لگی
در کھڑکاون آ گئی رات
اسد سکدے دل دی آخر
موجھ لہاون آ گئی رات

●

محترم برادرم اے۔جی جوش جی!

خیراں مہراں!

تہاڈے ''ادب دوست'' دے ڈاکٹر سعید اقبال سعدی ہوراں جی راہیں کدے کدے درشن دیدار ہوندے رہندے نیں۔ مارچ ۲۰۰۵ء دا پرچہ زاہد حسن ہوراں جی دے ذریعے ملیا۔ ایہ خالص ادبی پرچا اے جتھے ہولی ہولی ادب دے قاری گھٹ دے جارہے نیں اوتھے ادبی رسالے وی ہن نہ ہون دے برابر رہ گئے نیں۔ ایس کڑے وقت وچ انج دے ادبی پرچے سوا ہرے جاری رکھنا بڑی ہمت حوصلے تے جگرے دی گل اے۔ تہانوں ایس دی جنی وی داد دتی جائے گھٹ اے۔ ہن دا پرچہ سرورق ولوں تے ایناں جاندار نہیں جھدے وچ سونامی طوفان وکھایا گیا اے۔ پر ادبی پرچیاں وچ جو کجھ ہونا چاہیدا اے اوہ سب کجھ ایہدے وچ موجود اے۔ میں پنجابی دا چاکر آں تے ایہدے وچ پنجابی حصے بارے گل کراں گا۔ ادب دوست دے پنجابی حصے وچ نثر کوئی نہیں۔ تبصرے توں سوا (حالانکہ نثر دے وی کجھ صفحے ہونے چاہیدے نیں) حصہ نظم وچ وی اک گیت نظماں نیں غزل کوئی نہیں۔ غزل وی ہونی چاہیدی اے۔ زاہد حسن تے محمد اکرم سعید ہوراں دیاں نظماں بہت اچھیاں نیں۔ زاہد حسن دی وڈی نظم دے یارہویں مصرعے نوں ایسراں ہونا چاہیدا اے۔ ''اساں سینے چاک کرائے''

لگدا اے رانجھا چاک سیالاں دی لاپرواہی دا شکار ہو گیا سی تے زاہد دا چاک پروف ریڈنگ دی لاپرواہی دا شکار ہو گیا اے۔ انجے محمد اکرم سعید ہوراں دی نظم ''رستہ نہیں لبھدا'' دا چوتھا مصرعہ ''نھیر منھیرا جاپے'' ہونا چاہیدا اے۔ البتہ اختر خیال ہوراں دا گیت ہیئت دے لحاظ نال تے ٹھیک اے پر اک دو جھوکاں کھان نال سماں پیدا نہیں کر سکیا۔ گیت دے پہلے ٹوٹے دا پنجواں مصرعہ ایسراں ہو جاندا تے چنگا سی۔

بول پیار دے رہاں سناندی　　　یا　　　بول پیار دے پئی سناندی

انجے دا کوئی ہور سبب وی ورتیا جا سکدا سی

گیت دے آخری ٹوٹے دے تیجے مصرعے نوں ''دل دا حال میں کنج سناندی'' یا ''کنھوں دل دا حال سناندی'' کرلیا جاندا تے ایہ سقم دور ہو جانے سن تے مصرعیاں دے چارے رکن سچجے ڈھنگ نال پورے ہو جانے سن۔ ایہ ایناں کو کم تسیں آپ یا ڈاکٹر سعید اقبال سعدی ہوری وی کر سکدے سن آخر ایڈیٹر دا وی کوئی حق ہندا اے۔ فر تسیں دونویں بندے پنجابی دے وی استاد او تہاڈے تے دو شعری مجموعے ''دل دے بوہے'' تے ''دل دیاں باریاں'' چھپ چکے نیں۔ بھاویں نظروں نہیں گزرے پر تہاڈی اردو شاعری وانگوں یقیناً معیاری تے خوبصورت ہون گے۔

مولا کریم تہانوں خوش رکھے تسیں ہمیش ادب دی خدمت کردے رہو۔

...... امین خیال ......